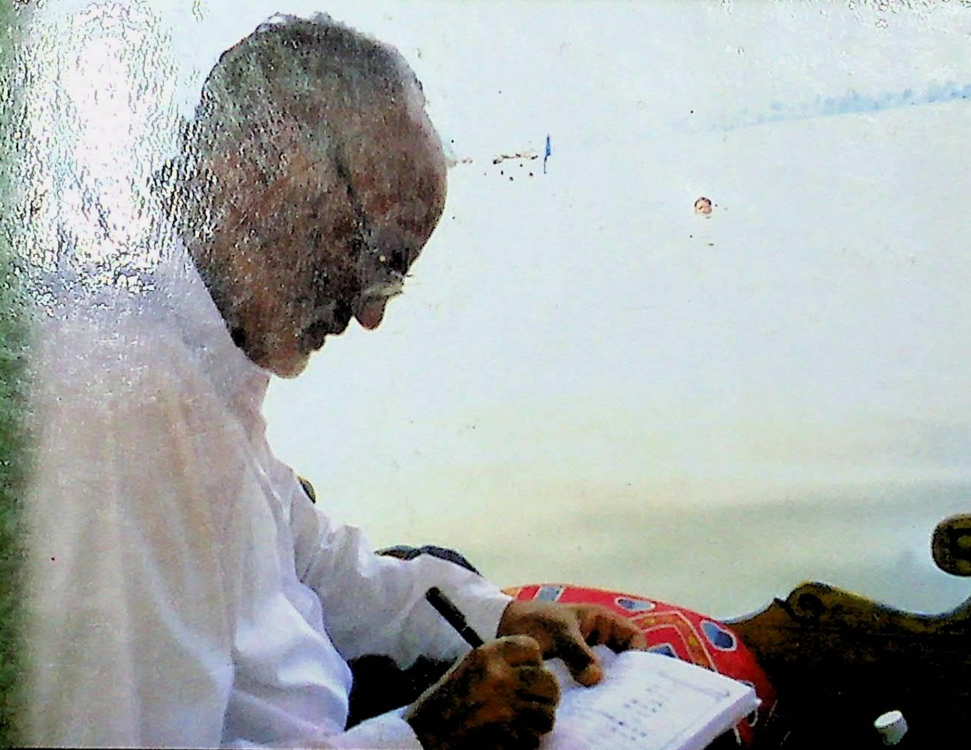
مر مجید کے بہترین افسانے



مرتبہ و مقدمہ

سلیم سالکؔ

meezan میزان PUBLISHERS

زان پبلشرز سرینگر کشمیر

55

عمر مجید کے بہترین افسانے

مرتبہ و مقدمہ

سلیم سالکؔ

 جملہ حقوق بحقِ مرتبہ محفوظ

- نام کتاب : عمر مجید کے بہترین افسانے
- نوعیت : افسانے
- مرتب : سلیم سالک
- بار اول : ۲۰۰۹ء
- قیمت : 250/=
- ناشر : میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر

Title : Umar Majeed Kay Behtareen Afsanay

Complied By : Salim Salik

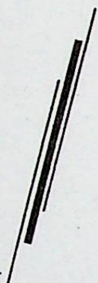
Price : 250/=

Publisher : **Meezan Publishers**

Opp. Fire and Emergencey Services
Headquarters, Batamaloo Srinagar,
Kashmir. 190009
Tel: (O) 0194-2470851;
Fax : 0194-2457215
(Mob) 9419002212, 9906677468
Email: Meezanpublishers@rediffmail.com

باهتمام : شبیر احمد

انتساب



عبدالخالق

کے نام

جنہوں نے

عمر مجید

کی

گود میں دم توڑ دیا۔

ترتیب

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

۲۰۰۵ء کی بات ہے کہ ہمارے شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ارتضیٰ کریم ایک توسیعی لیکچر دینے کے لئے تشریف لائے تھے، تو انہوں نے اردو افسانے کے حوالے سے کچھ بنیادی باتوں کا خلاصہ پیش کیا، اور آخر پر سوال وجواب کا سلسلہ بھی چلا۔ تو میں نے موضوع کی مناسبت سے پروفیسر موصوف سے یہ سوال کیا کہ جب بھی افسانوں کے حوالے سے تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں کہیں بھی کشمیر کے افسانہ نگاروں کا ذکر نہیں ملتا، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ میرے سوال پر کچھ دیر توقف کر کے انہوں نے یوں وضاحت کی، کہ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اول یا تو کشمیر کے افسانہ نگاروں کے باہر کے رسالوں سے رابطے نہیں، دوئم یا تو ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، سوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اردو میں معیاری افسانے لکھنے سے قاصر ہوں۔ حقائق کی نشاندہی ہونے کے بعد میرے دل میں یہ امنگ جاگی، کیوں نہ ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کا ایک جامع انتخاب ترتیب دیا جائے، جس سے اس بات کا ازالہ ہوجائے کہ کشمیر کے افسانہ نگاروں کو افسانے لکھنے ہی نہیں آتے ہے۔

اس سلسلے میں، میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔تو قریباً اسی (۸۰) افسانہ نگاوروں کی ایک طویل فہرست تیار ہوگئی، جو کہ میرے لئے حیرت افزا بات تھی، لیکن ہر افسانہ نگار کو شامل انتخاب کرنا ممکن نہیں تھا، تو کئی دنوں کی محنت شاقہ کے بعد کل پچیس افسانہ نگاروں کی ایک حتمی فہرست بنانے میں کامیاب ہوا۔

جب میں نے اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ڈھول ڈالا، تو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ افسانہ نگاروں نے "مجذوب کی بڑ" سمجھ کر نظر انداز کر دیا، تو کسی نے درخور اعتناء بھی نہیں سمجھا۔ کچھ افسانہ نگاروں کی تخلیقات پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ان کو افسانہ نگار کس لحاظ سے کہا جاتا ہے، تو پروفیسر موصوف کی بات یاد آ گئی کہ یہاں میعاری افسانہ لکھے ہی نہیں گئے ہیں۔ اپنی خفت مٹانے کے لئے میں نے پھر اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا۔ تو کچھ مثبت نتائج ملے۔

اس سلسلے میں جب میں پہلی بار عمر مجید کا ایڈریس معلوم کر کے ان کے گھر واقع سونہ وار پہنچا، تو دل میں یہ وسوسہ ضرور تھا کہ کہیں عمر مجید نو آموز سمجھ کر دروازے سے ہی نہ لوٹا دے، لیکن اس کے برعکس عمر مجید نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ خاطر تواضع کی اور اگلی ملاقات میں اپنے کچھ افسانے، سوانحی خاکہ اور ایک عدد فوٹو گراف دینے کا وعدہ کیا۔ یہ ملاقات میرے لئے حد سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔ میں اپنے کام کو حتمی شکل دینے کے لئے پھر دیگر افسانہ نگاروں کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ جب میں نے کئی دنوں تک عمر مجید سے رابطہ نہیں کیا تو وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہفتہ روزہ "کشمیر عظمیٰ" کے آفس

تک پہنچ گئے۔ تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگایا اور ساتھ میں ایک لفافہ بھی تھما دیا۔ جس میں کچھ افسانوں کے علاوہ مختصر سوانحی خاکہ اور ایک پرانی تصویر بھی تھی، جس کو دیکھ کر اخبار کے ایڈیٹر جاوید آذر نے عمر مجید پر فقرہ کستے ہوئے کہا کہ عمر صاحب کیا آپ بھی دوسرے ادیبوں کی طرح بڑھاپے میں جوانی کی فوٹو ساتھ رکھتے ہیں، یہ سنتے ہی عمر مجید ہنسنے لگے اور برجستہ جواب دیا کہ چور چوری سے جائے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد پتہ چلا کہ انہوں نے روزنامہ ''آفتاب'' کو خیر آباد کہہ کر ہفتہ روزہ ''رہبر'' کی ادارت سنبھالی ہے۔ نور شاہ صاحب کے توسط سے مجھے ملنے کے لئے کہا تو ایک دن میں آفس میں ملنے چلا گیا۔ عمر صاحب کمرے کے کونے میں پروفیسر بدخشی صاحب کے ساتھ کسی معاملہ پر بحث کر رہے تھے تو مجھے دیکھ کر کرسی سے کھڑے ہو گئے اور بغلگیر ہو کر گویا ہوئے کہ آؤ برخوردار میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تم میرے لئے ایک مضمون ''۲۰۰۶ میں ریاست جموں و کشمیر کے ادیبوں کی کاوشیں .... کتابوں کے حوالے سے'' تحریر کرو۔ میں نے مضمون لکھنے کی حامی بھر لی، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اگر غیر دانستہ طور ہی سہی کسی کا نام چھوٹ جائے تو وہ غلطی قابل معافی نہیں بلکہ قابل گردن زدنی ہے۔ یہ مضمون میں نے چار قسطوں میں لکھا، تو بہت خوش ہوئے۔ اگر چہ ان کے ایک عزیز دوست نے مجھے ہدف تنقیص بناتے ہوئے ''ادبی ڈنڈھورچی'' کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ عمر مجید نے وہ مراسلہ مجھے تحفۃً عنایت کر کے فرمایا، برخوردار سنبھل کر لکھو کیونکہ تمہاری تحریر

کسی بھی ادیب کی دل آزاری کا سبب بن سکتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی عمر مجید کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ اگر چہ بعد میں ان اصحاب سے میرے اچھے تعلقات استوار ہو گئے۔

عمر مجید سے جب بھی ملاقات ہوتی تو افسانوں کے حوالے سے ہی بات ہوتی۔ وہ اس بات سے نالاں تھے کہ لوگ اب مطالعہ ومشاہدہ کے بغیر افسانے لکھتے ہیں۔ ان کا یہ جملہ قابل توجہ ہوتا کہ برخوردار میں نے زندگی میں کل چالیس افسانے لکھے ہیں اور قہقہہ مار کر مزید کہتے کہ اس حساب سے میں نے سال میں ایک ہی افسانہ لکھا ہے جبکہ لوگ سال میں ایک کتاب لکھ دیتے ہیں۔ تو مجھے منٹو کا وہ جملہ یاد پڑتا جس میں وہ بیدی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ''بیدی، تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔''

ایک دفعہ عمر مجید لال چوک میں اضطراری عالم میں ملے۔ تو میں نے خیر و عافیت پوچھنے کے بعد پریشانی کا سبب پوچھا۔ تو انہوں نے برجستہ جواب دیتے ہوئے کہا کہ برخوردار تم نے دنیا میں مجھ سے زیادہ کم فہم آدمی دیکھا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے زندگی میں کل دو ناول لکھے ہیں جو بدقسمتی سے دونوں میرے پاس نہیں ہیں، میری خواہش تھی کہ ''درد کا دریا'' پھر سے شائع کروں، لیکن میرے پاس کوئی نسخہ موجود نہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ جناب آپ بے فکر رہیں کل تک آپ کو ناول مل جائے گا۔ میں گھر گیا اور ذاتی کتب خانے سے

مذکورہ ناول ڈھونڈ کر عمر مجید کے دفتر ''آفتاب'' پہنچ گیا۔ تو ناول کا نسخہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی کہ جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اچانک مل جائے۔ لیکن المیہ کی بات ہے کہ جب عمر مجید انتقال کر گئے، تو کوئی صاحب اسی ناول کے نسخے کو لے اُڑا۔ بعد میں عمر مجید کے فرزند سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس ناول کو چھاپنے کے لئے کسی کو دس ہزار کی رقم پیشگی بھی دی تھی۔ لیکن اس پبلشر کا پتہ ہنوز نہیں چلا۔

جب انسان کا رخت سفر باندھنے کا وقت قریب آتا ہے تو اس کو محسوس ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے عمر مجید نے محسوس کیا کہ اب اپنے افسانوں کو جمع کرنا چاہئے، تو انہوں نے مجھے گھر بلایا۔ حسب سابق خاطر تواضع کرتے ہوئے کہا کہ برخوردار اب شاید زندگی وفا نہ کرے، تم یہ سارا مواد لیکر اس میں قابل اشاعت افسانے ترتیب دے کر ان کو ایک کتابی شکل دو۔ میں نے افسانوں کا یہ پلندہ بیگ میں رکھ کر کہا، جناب انتخاب میں اپنی مرضی سے کروں گا۔ تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اسی لئے تمہارا انتخاب کیا ہے۔

وقت گزرتا گیا اور میں گھریلو پریشانیوں میں اتنا الجھ گیا کہ عمر مجید کے افسانے سرسری مطالعہ کے بعد کتابوں کے ڈھیر کے نیچ دب گئے۔ تو کئی مہینوں کے بعد ایک دن عمر مجید نے فون کر کے مجھے گھر کا ایڈریس مانگا، میں ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے لاکھ جتن کئے کہ میں خود حاضر ہو جاؤں گا، لیکن انہوں نے ایک نہیں مانی۔ مجھے مجبوراً ایڈریس دینا پڑا۔ میں قمرواری چوک میں ان کا انتظار کرنے لگا، تو میں نے عمر مجید کو ایک گاڑی سے اترتے ہوئے

دیکھا۔ ہاتھوں میں ایک بڑا سا لفافہ اُٹھایا ہوا ہے۔ میں نے منت سماجت کی
ایک کلو میٹر کا سفر آٹو میں کرتے ہیں ،تو در جواب ہنستے ہوئے کہا کہ
برخوردار میں نے پوری زندگی پہاڑوں کو سر کرتے ہوئے گزاری ہے اور تم
مجھے بوڑھا سمجھ کر آٹو میں سفر کرنے کو کہتے ہو۔ جوں ہی میں نے گھر پہنچ کر ان
کو افسانوں کا پلندہ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ اس میں کل گیارہ افسانے قابل اشاعت
ہیں۔ تو انہوں نے جلدی میں افسانوں کا پلندہ بغل میں دبائے گھر کی راہ لی۔
اگلے روز میں کشمیر عظمیٰ میں یہ اشتہار پڑھتا ہوں کہ عمر مجید کا افسانوی مجموعہ
عنقریب شائع ہو رہا ہے ، یہ عبارت پڑھ کر مجھے عجیب لگا کہ عمر مجید کو اتنی کیا
جلدی پڑی ہے لیکن اس بات کا خلاصہ ایک مہینے میں ہی ہوا جب شبیر ماٹجی
نے مجھے فون پر یہ اطلاع دی کہ مجید صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو مجھے اپنی غیر
سنجیدگی کا احساس ہوا۔

عمر مجید کی تعزیت پرسی کے دوران اردو اکادمی کے اراکین نے اس بات
کی طرف توجہ دلائی کہ عمر صاحب کا افسانوی مجموعہ ضرور شائع ہونا چاہئے۔
اب اس کی ذمہ داری کس کو سونپی جائے تو نور شاہ صاحب نے میرا نام تجویز
کیا۔ ع قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

پھر میں نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا تو ان کے گھر سے کل چار افسانے ملے،
نہ جانے عمر مجید نے وہ مسودہ کہاں رکھا تھا اس بابت پتہ نہیں چلا۔ میں نے
نئے سرے سے افسانوں کی تلاش شروع کر دی۔ جس میں قبلہ نور شاہ صاحب
نے بھر پور تعاون کیا۔ انہوں نے ذاتی کتب خانہ میرے لئے وقف رکھ دیا،

اور ہمیشہ کام کے بارے میں رہنمائی کرتے رہے، جب کتاب میں تاخیر ہونے لگی تو انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر برادرم شبیر ماٹجی کا ذکر خیر نہ کیا جائے۔ انہوں نے مواد کی تلاش و جستجو میں میری صرف معاونت ہی نہیں کی بلکہ اس کو کتابی شکل دینے میں ہمہ وقت تیار بھی رہے۔ ساجد عمر کا شکر گزار ہوں انہوں نے مجید صاحب کے فوٹو گراف عنایت کیے۔ جنید جاذبؔ کی پارکھی نظر کا گرویدہ ہوگیا، انہوں نے کتاب کے متعلق کچھ اہم مشورے عنایت کئے۔ آخر پر اپنے ہر دلعزیز دوست رؤف راحت کا ممنون و مشکور ہوں کہ ان کے بغیر میرا ہر کام ادھورا ہی رہا کرتا ہے۔

سلیم سالک
سری نگر کشمیر

تاریخ
یکم نومبر ۲۰۰۹ء

مقدمہ

قدیم زمانے سے ہی کشمیر علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں تہذیب و تمدن، زبان و ادب اور سیاست و تجارت ہر معاملے میں کشمیری قوم فراغ دل رہی ہے۔ جہاں تک ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کا تعلق ہے اردو زبان ہماری ریاست میں سرکاری زبان تسلیم کی گئی ہے کیونکہ مہاراجہ کے دور سے ہی اس زبان کو رابطہ کی زبان کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ ملک کے دیگر ریاستوں کے برعکس یہاں اردو شعر و ادب کی محفلیں انیسویں صدی کے آخر میں ڈوگرہ دور میں ہوئی۔ اسی دور میں مقامی شاعروں اور ادیبوں کا ایک حلقہ بن گیا جن میں ہر گوپال خستہؔ، خوشی محمد ناظرؔ، سالگرام سالکؔ، محمد دین فوقؔ، محمد عمر نور الٰہی، اللہ رکھا ساغر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشی۔ اس طرح ریاست میں اردو ادب کی کونپلیں انیسویں صدی میں ہی پھوٹنے لگیں۔ اخبارات اور رسائل کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہاں کے ادباء و شعرا کی نگارشات لاہور اور پنجاب کے رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ جوں ہی لالہ ملک راج صراف نے ۱۹۲۴ء میں "رنبیر" جاری کیا، تو ریاست میں ہر طرف اخبارات نکلنے شروع ہو گئے، جو یہاں کے ادیبوں کے لئے نیک فال ثابت ہوا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کی ترقی و ترویج میں مقامی اخباروں نے ایک خاص رول ادا کیا ہے یہاں کی نئی پود کی آبیاری کرنے اوران کو ایک راہ گزر عطا کرنے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کا سرسری جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوئے اخبارات پر ایک نظر دوڑائی جائے تا کہ صورت حال کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں نکلنے والا اخبار ''ہمدرد'' پہلا اخبار ہے جہاں باقاعدہ ادبی نگارشات کو جگہ دی گئی۔ یہاں تک کی ادبی ایڈیشن بھی نکالے گئے۔ بقول برج پریمی:۔

> ''ہمدرد کے ادبی ایڈیشن سے دو فائدے ہوئے۔ اولاً یہ کہ کشمیر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں اضافہ ہوا۔ اور دوئم یہ کہ یہاں بھی لوگوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقعہ ملا۔ اور بعض ایسے قلمکار نمودار ہوئے جن کے قلم کی توانائیوں نے بعد میں ہندوپاک میں دھاک جمادی''۔ ۱

ہمدرد کی خدمات کا اعتراف قائداعظم محمد علی جناح ان الفاظ میں کرتے ہیں ''میں ہمدرد کو ٹائمز لندن کی قبیل کا اخبار سمجھتا ہوں'' اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہمدرد کا کیا معیار رہا ہوگا۔ ہمدرد کی اس روایت کو بعد میں ''خدمت'' نے بھی برقرار رکھا۔ غلام رسول عارف اور مولانا محمد مسعودی کی کاوشوں سے وادی کے ادباء وشعرا بڑی ضابطگی سے ''خدمت'' کے لئے لکھنے لگے۔

۱: (جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما........ صفحہ ۶۳)

''خدمت'' کی ادارت میں ہمیشہ صاحب قلم حضرات وابستہ رہے ہیں۔ خصوصاً پنڈت نند لال واتل کی خدمات سرہانے کے قابل ہیں، جس کا اعتراف پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی ضخیم کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں کیا ہے کہ ''ادبی خدمات میں واتل سنجیدہ فکر، معتدل اندازِ نظر کے حامل اہل صحافت میں سے ہیں''۔ اس طرح یہاں کے ادیبوں کو ابتداء میں ہی اخباروں کے وسیلہ سے اپنی ادبی نگارشات دوسرں تک پہنچانے کا موقعہ میسر ہوا۔

۱۹۴۷ء کے سانحہ سے کشمیر کے حالات بھی دگرگوں ہوگئے۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا ہوگیا۔ سیاسی اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اخبارات پر بھی برا اثر پڑا۔ کچھ اخبارات وقتی طور نکلنے بند ہوگئے اور کچھ نامساعد حالات کے نذر ہوگئے۔ اس دور میں جو جیالے میدان صحافت میں اتر آئے، ان میں خواجہ ثناء اللہ بٹ سرفہرست ہیں۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ نے جون ۱۹۵۷ء میں ہفتہ روزہ ''آفتاب'' نکالنا شروع کیا۔ اگرچہ خواجہ صاحب کے لئے یہ نیا میدان نہیں تھا، کیونکہ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں مظفر آباد سے ہفتہ روزہ ''کشمیر'' جاری کیا تھا لیکن بیباک رویہ اختیار کرنے پر ان کو وہاں سے ملک بدر کر کے کشمیر بھیج دیا گیا۔ خواجہ صاحب کی کوششوں سے ہفتہ روزہ ''آفتاب'' چند مہینوں میں ہی روزنامہ کی شکل میں نکلنے لگا۔ جو آج بھی مسلسل نکل رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے ابتداء سے ہی کشمیر کے اطراف واکناف کے سماجی اور سیاسی ترجیحات کو مدنظر رکھا۔ جس سے اخبار کی مقبولیت میں اضافہ

ہوااور ''آفتاب'' عوام کی دل کی دھڑکن بن گیا۔

خواجہ صاحب خود ایک صاحب طرز صحافی ہے۔ علم وادب سے گہرا تعلق ہے۔ سیاسیات وسماجیات کے ساتھ ساتھ ادبیات سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔ خصوصاً علامہ اقبال سے قلبی مناسبت رکھتے ہیں۔ اسی لئے اپنے ادارتی کالم کے سرنامے کے طور پر علامہ اقبال کا یہ شعر ہمیشہ لکھتے آئے ہیں۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

اس کے علاوہ اپنے فکاہیہ کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کا عنوان بھی علامہ کے شعر سے ہی مستعار لیا ہے[1] اس کالم میں زبان کی چاشنی اور موضوع کی تازگی قاری کو آخر تک گرفت میں رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب کی ابتداء سے ہی یہ کوشش رہی ہے کہ نئی نسل کو لکھنے کی طرف راغب کیا جائے۔ اس لئے انہوں نے اخبار میں باقاعدہ ادبی نگارشات کو جگہ دی۔ چونکہ کشمیر میں یہ بدقسمتی ہمیشہ سے رہی ہے کہ یہاں باقاعدہ کوئی ادبی رسالہ نہیں نکلا ہے سوائے چند سرکاری رسائل کے، جن میں منظور نظر ادباء و شعراء ہی جگہ پاتے تھے، باقی نئے لکھنے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔

---

[1] (عمر مجید نے خاکسار کے ساتھ ایک ذاتی ملاقات کے دوران اس بات کا انکشاف کیا کہ جب ان کا پہلا افسانہ 'ایک بوڑھا ولر کے کنارے'' شائع ہوا تو خواجہ صاحب کو افسانے کے عنوان سے کالم لکھنے کی تحریک ملی۔)

خواجہ ثناء اللہ بٹ نے ''آفتاب'' کے ذریعہ نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم دیا، جس سے نوخیز ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ سامنے آئی ۔ یہ دور اس حوالے سے زرخیز تھا کہ لکھنے والوں نے نئے رجحانات اور نئے میلانات کے تحت اپنی تخلیقی پیاس بجھانی شروع کردی تھی۔ یہاں کے ادبی ماحول میں گہما گہمی پیدا ہو گئیں تھیں۔آفتاب کے ادبی صفحات ادیبوں کے لئے روح افزا سے کم نہ تھے۔جن ادیبوں نے باقاعدہ آفتاب کی درسگاہ سے ہی اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی۔ان میں عمر مجید، بشیر گاش، ایس ایم قمر، میم میم صدیق، یوسف جمیل، عبدالرحمان مخلص، نذیر مشتاق، شمس الدین شمیم، خالد بشیر، غلام نبی شاہد یاسین فردوسی، جان محمد آزاد، انیس ہمدانی، الطاف ناؤ پوری، ظہور شاعر، عبدالرشید فراق، مقبول ساحل، پیر عبدالشکور، جاوید ماٹجی، قاسم سجاد وغیرہ قابل ذکر ہیں (فہرست نامکمل ہے) سے اندازہ ہوسکتا ہے آفتاب کے صفحات کس طرح ایک نسل کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

روزنامہ ''آفتاب'' میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے ہیں، جن پر ایک تحقیقی کام ہوسکتا ہے۔اس سلسلے میں خاکسار کا ایک طویل مضمون ہفتہ روزہ کشمیر عظمیٰ کے خاص شمارہ نمبر ۳۰، جلد ۴ میں ''آفتاب کی پچاس سالہ خدمات....ایک سرسری مطالعہ'' میں شائع ہوا ہے۔

''آفتاب'' کی بدولت لکھنے والوں کا ایک ایسا کارواں سامنے آیا ہے جن میں اگر چہ کچھ قلمکار ہی اپنا سفر جاری رکھ سکے۔لیکن ہم ان لکھنے والوں کو فراموش نہیں کرسکتے جنہوں نے اُس دور میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو کی

ترقی وترویج میں ایک اہم رول ادا کیا۔ جس کو دیکھ کر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ دور کشمیر میں افسانے کے حوالے سے ایک ذرین دور رہا ہے۔ ان ادیبوں نے مختلف رجحانات و تحریکات سے متاثر ہو کر اپنی تخلیقی اپج کو جولانی عطا کی۔ جان محمد آزاد اس سلسلے میں رقم طراز ہیں؛۔

"یہ موجودہ صدی کے چھٹے عشرے کا وسط کا زمانہ تھا۔ اردو ادب کا کارواں دھندلا سا گیا ہے، اس کارواں کے سرخیل رہنما کچھ تھکے تھکے سے نظر آنے لگے تھے۔ اس میں نئے راہ گیروں کو اپنی طرف کھینچنے کی جیسے سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اس پُر پیچ موڑ پر روزنامہ "آفتاب" کے ادبی صفحات اس کارواں کے لئے ایک نخلستان ثابت ہوئے۔ اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں مارتنڈ، ہمدرد اور خدمت جیسے اخبارات نے جو نمایاں رول اس سے قبل انجام دیا تھا وہ ہر لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ لیکن روزنامہ "آفتاب" کی ارغوانی ادبی محفلیں کشمیر میں اردو کی بقا اور اس کے وقار کے لئے ایک فالِ نیک ثابت ہوئیں۔ اس ادبی محفل کے دروازے ہر مکتبِ فکر کے یاران نکتہ داں کے لئے کھلے تھے۔ چنانچہ نوخیز ادیب کھل کر سامنے آنے لگے۔ نئے رجحانات اور نئے میلانات کی ایک اچھوتی شروعات ہونے لگیں۔ ابھرتے ہوئے ادیبوں کا یہ جواں سال کارواں عصری مسائل کو سمیٹتا ہوا اور اپنی نئی راہیں متعین کرتا ہوا خود اعتمادی سے نئی بلندیاں سر کرتا رہا۔ عمر مجید اسی کارواں کے راہبر تھے۔" [1]

[1]: (بحوالہ: جموں و کشمیر کے اردو مصنفین۔ صفحہ ۲۷۴)

اس بات میں دو رائیں نہیں کہ عمر مجید کو بنانے میں آفتاب کا رول رہا ہے، اسی لئے عمر مجید نے آخری دم تک ''آفتاب'' کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس بات کا اعتراف خود عمر مجید نے بھی کیا ہے:۔

''میں روزنامہ ''آفتاب'' کی پیداوار ہوں۔ ''آفتاب'' نے مجھے گویائی بخشی اور پروان چڑھایا۔ اس لحاظ سے مدیر ''آفتاب'' خواجہ ثناء اللہ بٹ ناچیز کے مربی بھی ہیں اور مخدوم بھی''۔[1]

عمر مجید کا اصلی نام عبدالمجید میر تھا۔ ان کا جنم ۱۹۴۴ء میں پالپورہ سونہ وار سرینگر میں ہوا۔ ان کے والد ماسٹر غلام قادر میر بسکو سکول کے ایک معروف استاد تھے، اس لئے گھر میں علمی ماحول پہلے سے ہی قائم تھا۔ عمر مجید نے بھی مدرسی کا پیشہ اختیار کیا اور سرینگر کے بسکو سکول، جہاں وہ خود بھی طالب علم رہے تھے میں، ۴۰ برس تک مدرسی کے فرائض انجام دیئے۔ عمر مجید بچپن سے ہی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اساتذہ کی صحبت نے خوب سے خوب تر کی جستجو کی ترغیب دی جن میں پروفیسر مخمور بدخشی بھی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اردو صحافت میں بھی زور قلم آزمایا اور قریب تین دہائیوں تک وہ روزنامہ آفتاب میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کے وابستہ رہے۔ عمر مجید روزنامہ آفتاب کے مستقل کالم نگار رہے اور انہوں نے کئی عنوانات کے تحت کالم تحریر کئے، جبکہ حالیہ برسوں میں ان کا کالم ''کشمیر نامہ'' کافی مقبول ہوا۔ انہوں نے اردو

[1] (بحوالہ روزنامہ کشمیر عظمیٰ۔۔۔۱۵ جنوری ۲۰۰۸)

صحافت کے علاوہ ناول نگاری میں اپنا الگ مقام بنایا۔ان کے دو ناول 'یہ بستی یہ لوگ' ۱۹۷۰ میں اور دوسرا ناول 'درد کا دریا' ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ انکا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۶۸ء میں ''اجالوں کے گھاؤ'' نام سے شائع ہوا ہے۔عمر مجید کئی ادبی انجمنوں کے ساتھ وابستہ رہے۔ابتداء میں ''تلاش ادب' کے ساتھ وابستہ رہے جبکہ بعد ازاں انہوں نے ''رائٹرس کلب سرینگر' اور اردو اکاڈمی جموں وکشمیر' کی داغ بیل ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ان کو بے باک صحافتی خدمات کے لئے کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔آخر کار ۲۳ دسمبر ۲۰۰۸ کو انتقال کر گئے۔

عمر مجید کی پہلی کہانی ۱۹۶۵ء میں روزنامہ آفتاب میں شائع ہوئی ،جس کا عنوان 'ایک بوڑھا ولر کے کنارے' تھا۔اس کہانی کے بارے میں عمر مجید خود رقمطراز ہیں:۔

''مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں اپنا افسانہ لے کر آفتاب کے دفتر میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ داخل ہوا تھا۔گرمیوں کا زمانہ تھا،خواجہ صاحب اس زمانے میں پینٹ اور پورے آستین کی قمیض پہنا کرتے تھے۔آپ نے میرے سلام کا جواب نہایت خلوص کے ساتھ دیا تھا اور شاید عادت کے مطابق مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔بغیر کچھ پوچھے یا کہے آپ نے میرا افسانہ لے لیا تھا اور ایک ہی نشست میں پڑھا تھا۔میں خاموش بت بنا آپ کو دیکھ رہا تھا۔''ٹھیک ہے!''بس آپ نے دو لفظ کہے تھے اور میں کسی وحشت زدہ جانور کی طرح دفتر سے بھاگ نکلا تھا۔اور پھر تیسرے یا چوتھے روز میرا پہلا افسانہ ''ایک بوڑھا ولر کے کنارے'' آفتاب کے زریں اوراق کا زینت بنا تھا۔[1]

[1]:(خواجہ ثناءاللہ...فن اور شخصیت، ہفتہ روزہ کشمیر عظمیٰ، جلد۴، شمارہ نمبر ۳۰ ،صفحہ ۶ (آفتاب نمبر)

یہ کہانی شائع ہونے کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پہلی کہانی پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ عمر مجید کی پہلی کہانی ہے الفاظ کی دروبست اور موضوع کا تنوع اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عمر مجید منفرد افسانہ نگار ہے۔ ابھی عمر مجید نے چند ہی افسانے لکھے تھے کہ اردو کے معروف نقاد و محقق اور تاریخ نویس عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں:۔

''عمر مجید کو افسانے لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ ان کی نظر اپنے اطراف کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ان کے مشاہدات کو وہ سلیقہ سے بیان کرنے کے اسلوب پر بھی قدرت رکھتے ہیں، نیچے کے طبقے کے لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی قابل رشک زندگی ان کا عام موضوع ہے''۔[1]

عمر مجید نے جب اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کیا تو پورے برصغیر میں جدیدیت کا چلن عام تھا۔ جدیدیت کی اندھی تقلید میں تخلیق کاروں نے روایتی نکتہ نظر چھوڑ کر علامتی اور تجریدی تحریریں لکھنے کو ہی ترجیح دی۔ جس سے کہانی بھی متاثر ہوگئی، یہاں تک کہ افسانہ تجریدیت اور علامت کی بھول بھلیوں میں اس طرح کھو گیا کہ قاری کہانی کی لذت سے محروم ہوگیا۔ بعض افسانہ نگاروں نے ریاضی کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کے لئے کہانی کا کینواس ہی چنا، جس سے عام قاری کہانی سے بہت دور ہوگیا۔ اس طرح کے رجحان کے باقاعدہ اثرات ہماری ریاست کے تخلیق کاروں میں بھی جابجا نظر آنے لگے۔ اس صورت حال کا جائزہ ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی اس طرح لیتے ہیں:۔

[1]: (کشمیر میں اردو ،.......... جلد۳، صفحہ ۲۱۹)

''اس دور میں جموں و کشمیر کے نئے لکھنے والوں نے ایک طرف ملک گیر پیمانے پر اردو ادیبوں کے سبک کی پیروی کی اور یہاں کے معاشی و سماجی پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھی ۔ دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر مروج رجحانات مثلاً مارکس کے معاشی اور فرائیڈ کے جنسی خیالات کا اثر بھی قبول کیا اور اس طرح سے مارکسزم اور تحلیل نفسی کے ساتھ ساتھ وجودیت ، اشاریت ، اظہاریت ، تاثریت ، جمالیات ، شعور کی رو جیسے جدید نظریات سے متاثر ہو کر افسانے تخلیق کرنے کی کوشش کی ۔''[1]

اس طرح کی صورت حال عمر مجید کے سامنے بھی تھی لیکن وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اس کی دو وجوہات تھیں ۔ اول وہ پیشے سے ایک مدرس تھے ، دوئم وہ صحافت سے جوڑے تھے ۔ دونوں جگہوں پر ترسیل اظہار کے لئے عام وفہم اندازِ بیان اپنانا ایک طرح کی مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی ۔ جہاں تک افسانہ کی فنی اور تکنیکی جزیات کا تعلق ہے ان سے عمر مجید پوری طرح سے واقف تھے ۔ عمر مجید نے تخئیل کے بجائے کہانی کی تخلیق حقیقت کی تلخ آمیز تجربہ کی بنیاد پر رکھی ۔ اس کا رنگ و آہنگ ، اسلوب اور طرز نگارش اپنے ہم عصروں سے قطعی مختلف تھا ۔ بعض لوگوں نے عمر مجید کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ وہ علامتی افسانہ نہیں لکھ سکتا ۔ تو انہوں نے ''شہر کا اغوا'' لکھ کر ثابت کر دیا کہ اصل میں علامت کس طرح برتی جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں وہ خود رقم طراز ہیں ؛ ۔

(بحوالہ ''جموں و کشمیر میں اردو افسانے کے نئے افق'' ۔۔ ہمارا ادب ۱۹۷۸ ، صفحہ ۳۴۹)

''میں نہ ابہام کا دشمن ہوں اور نہ سہل پسندی کا قائل لیکن ایک افسانہ تب بنتا ہے جب اس میں افسانے کے تمام لوازمات موجود ہوں۔ اردو افسانہ کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ آج اردو میں سینکڑوں کی تعداد میں افسانے لکھے جا رہے ہیں اور پڑھے بھی جا رہے ہیں لیکن ان افسانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو اپنا نقش تا دیر قائم رکھ پاتے ہیں۔ ایک زمانے تک افسانوں سے کہانی کی گمشدگی کا بڑا چرچا رہا۔ خیر سے وہ دور بھی گزرا اور افسانے میں کہانی کی واپسی ہوئی لیکن کیا واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے۔ اگر واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے تو وہ کہانی کہاں ہے؟ کونسی ہے؟ اور وہ اپنا وجود منوانے میں آخر کامیاب کیوں نہیں ہو پاتی؟۔ مطلب یہ کہ نہ پلاٹ، نہ کردار، بس واقعات ہی واقعات آج کے افسانوں کی شناخت ہیں۔ کیا افسانہ واقعات کی کھتونی محض ہے؟''[1]

عمر مجید کے افسانے پڑھ کر صاف جھلکتا ہے کہ افسانہ نگار پیشہ سے ڈاکٹر یا انجینئر نہیں، بلکہ ایک استاد ہیں کیونکہ اکثر و بیشتر افسانوں کے بیانیہ میں ناصحانہ انداز ملتا ہے اور مکالموں میں تجربہ اور فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، جس سے عمر مجید کا نظریہ سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے:۔

[1]: (بحوالہ ''آج کا اردو افسانہ''۔ ہفتہ روزہ ''المختار'' سالنامہ ۲۰۰۶، صفحہ ۳۵)

☆ میں جانتا ہوں کہ بچپن بذاتِ خود معصومیت ہے، جوانی بذاتِ خود ایک حسن اور بڑھاپا بذات خود ایک دائمی بیماری ہے۔ (میری گلی کا غم)

☆ دراصل بہادر نظر آنے والا ہر شخص ازلی بزدل ہوتا ہے۔ اسے دو چیزوں کا ڈر لگا رہتا ہے، کوئی اُس سے اُس کی طاقت چھین نہ لے، اور اُس کا دشمن اُس پر غالب نہ آئے۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اپنے مدمقابل پر اپنی بھرپور طاقت سے وار کرتا ہے۔ (میری گلی کا غم)

☆ جب انسان خود اپنے آپ کے ساتھ اُلجھ کے رہ جاتا ہے۔ تو ہر چیز بے معنی سی لگتی ہے۔ بے روح اور بے رنگ اور شاید ایسے ہی موقعوں پر انسان جزیرہ بن کے رہ جاتا ہے۔ انسانوں کے سمندر میں رہتے ہوئے بھی الگ تھلگ اور تنہا۔ (برف کے پھول)

☆ انسان زندگی بھر منزلوں کی تلاش میں رہتا ہے لیکن ہر منزل پر پہنچ کر اسے کسی دوسری منزل کی تلاش میں سفر شروع کرنا پڑتا ہے...... تلاش دَر تلاش۔ منزل در منزل۔ سفر در سفر۔ منزل کہاں ہے؟ سفر کا انت کہاں ہوگا؟ کب ہوگا؟ سب کو معلوم ہوتے ہوئے بھی کسی کو نہیں معلوم۔ یا دیدہ دانستہ انجان بنا ہوا ہے۔ (ماتم کے بعد)

☆ زیادہ سوچنے سے ارادے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ (درد کا مارا)

ڈاکٹر اشرف اثاری عمر مجید کا خاکہ کھینچتے ہوئے ان کے افسانوں کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:۔

''ماسٹر جی وادیٔ کشمیر کے باصلاحیت افسانہ نویس ہیں۔
ان کی کہانیوں میں وہ کسک، وہ چبھن اور وہ درد ہوتا ہے کہ ان کی
بات دل میں ہی نہیں بلکہ روح کی گہرائیوں میں اثر کر کے وہاں

ارتعاش وتلاطم پیدا کر دیتی ہے۔سب سے پہلے ان کی کہانیاں انہیں رلاتی ہیں اور پھر وہ قارئین وسامعین کو رلاتی ہیں۔جب وہ کہانیاں اور افسانے تخلیق کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ، ٹپ، آنسو گرتے رہتے ہیں۔جب وہ اپنے کلاس روم میں، مستقبل کے ڈاکٹروں، انجینئروں، پروفیسروں اور افسروں کی تخلیق کرتے رہتے تھے تو ان کی لاٹھی خوب چلتی رہتی تھی اور ان کے شاگردوں کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ، ٹپ، آنسو گرتے رہتے تھے۔" [1]

عمر مجید کے کردار رومانوی کردار نہیں ہیں بلکہ ان سے حقیقت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں، حقیقت کی گہرائیوں تک جانا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ان کے افسانوں میں حقیقت کی جستجو ہے، ان میں کچھ نفسیاتی باریکیاں ہیں اور کہیں کہیں طنز کی لہر بھی پوشیدہ ہے۔ دیناناتھ (شہر کا اغوا)، تلاشی (عبدالعزیز)، ساجد (گونگے گلاب)، احمد (برف کے پھول) ، محمد منور (لاپتہ)، سکینہ (نوحہ)، غلام رسول (میرے وطن) یوسف (یہ شام بھی کہاں ہوئی) وغیرہ یہ سب کردار عام زندگی سے مستعار لے گئے ہیں۔

افسانہ کی بنیادی باتوں میں کہانی کی ابتداء کے ساتھ ساتھ کلائمکس کی باریکیوں پر بھی نظر ہونی چاہئے۔عمر مجید نے جہاں کردار نگاری، مکالمہ نگاری ، منظر نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے وہیں کلائمکس پر بھی توجہ دی ہے۔

[1]: روزنامہ اطلاعات، ۱۷ فروری ۲۰۰۸

افسانہ ''درد کا مارا'' کا مرکزی کردار واحد متکلم ''میں'' ایک آسودہ حال گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، گھر میں ہر طرح کی سہولیت میسر ہیں، دونوں لڑکے گلف میں اچھی نوکریاں کر رہے ہیں اور بیٹی بھی ایک اچھے سکول میں ملازمت کر رہی ہے۔ بیٹی کی شادی بھی ایک اچھے گھرانے میں طے ہوئی، شادی کے چھے سال خوشی خوشی گزر گئے، لیکن بدقسمتی یہ کہ بیٹی اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ بس پھر کہانی کا رخ بدل جاتا ہے اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ آخر کار بات طلاق تک پہنچتی ہے تو مرکزی کردار تھکا ماندہ پریشان ایک پارک میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا ہے تو اسی اثناء میں ایک بھکارن پھٹا پرانا برقعہ پہنے گود میں چھ سات ماہ کا بچہ لئے ہوئے بھیک مانگتے ہوئے سامنے آجاتی ہے تو بچہ دیکھ کر مرکزی کردار خیالوں میں کھو جاتا ہے اور پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال لیتا ہے۔ یہاں پر عمر مجید نے بہت سنبھل کر کہانی کا اختتام کیا ہے۔

''بابو جی...... صبح سے بچہ بلک رہا ہے''۔ دائیں ہاتھ میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں پرس کھولتا ہوں۔ دس بیس، پچاس، ایک سو، پانچ سو...... پانچ سو کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آتی ہے۔ وہ پانچ سو کا نوٹ گریباں میں ڈال دیتی ہے۔

بابو جی...... گھر میں بیوی نہیں۔ وہ مسکرا پڑتی ہے۔

میں اُس ادھ جلے مکان میں انتظار کر رہی ہوں۔ میرے جانے کے پانچ منٹ بعد آجانا''۔

کشمیر ہمیشہ تخلیق کاروں کا محبوب موضوع رہا ہے، اسی لئے قریباً ہر افسانہ نگار نے کشمیر کو موضوع سخن بناتے وقت من چاہی انداز سے کشمیر کی تصویر کشی کی ہے، جس سے بعض منفی پہلوں ہی ابھر کر آئیں ہیں۔ اسی لئے پریم ناتھ پردیسی کو بھی اپنے معاصرین اردو کے بیشتر غیر کشمیری افسانہ نگاروں سے شکایت ہے جنہوں نے کشمیر کو محض عیش گاہ کے طور پر پیش کیا ہے، خود ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''کشمیر کا ہر بد نصیب باشندہ خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہ دی۔ باہر کے چند نامور افسانہ نگاروں نے کچھ کہانیاں ضرور لکھیں مگر وہ بھی غلط انداز میں.....[1]

اس کے برعکس جب عمر مجید کے افسانوں میں دیکھتے ہیں تو ان کے موضوعات کشمیر اور کشمیر میں رہنے والوں کے ارد گرد ہی گھومتے ہیں۔ وہ کسی مبہم اور تجریدی لاگ لپیٹ کے بغیر ہی کہانی کی تشکیل کر۔تے ہیں۔ اس بات کی توثیق نور شاہ کے اس اقتباس سے ہوتی ہے۔

''عمر مجید کے افسانوں کا ایک الگ ہی انداز ہے۔ وہ افسانہ لکھنے کے ڈھنگ سے بخوبی واقف ہیں، وہ اپنے کردار زمین کی کھردری سطح پیر تلاش کرتے ہیں اور چن چن کر۔ انہیں اپنے افسانوں میں قید کر لینے ہیں۔ اسلوب کا ستھرا پن انکی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے کشمیر، کشمیریت اور کشمیر کی زندگی اُن کے محبوب ترین موضوعات ہیں۔''[2]

1: ''بہتے چراغ''، صفحہ نمبر ۷

2: (بحوالہ ''ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب..... صفحہ نمبر ۶۵ مطبوعہ ڈسٹنس ایجوکیشن، کشمیر یونیورسٹی)

کشمیر جب بیسویں صدی کے اواخر میں گرینیڈ دھماکوں اور گولیوں کی گھن گرج میں کہیں کھو گیا، تو گویا ہر شخص اپنے آپ سے جدا ہو گیا۔ غور و فکر کی صلاحیتیں معدوم، زبانیں مقفل اور قلم سیاہی کی لذت سے نا آشنا ہو گیا۔ تو اس کا شکار عمر مجید بھی ہوئے۔ اس دور کو انہوں نے گھر کی چہار دیواری میں ''کومہ'' کی شکل میں گزارا۔ تو بعض نام نہاد ادیبوں نے عمر مجید کی گوشہ نشینی کو یہ کہہ کر طعنہ دیا کہ اب عمر مجید کا حساس ذہن مفلوج ہو گیا ہے۔ عمر مجید نے اس دور کو کس کرب سے جھیلا، اس سے سب بے خبر تھے۔ انہوں نے دس سال کے شدید کرب کے احساس کو بانٹتے ہوئے ہفتہ روزہ ''کشمیر عظمیٰ'' کے مدیر جاوید آذر کے نام ایک طویل مراسلہ لکھا، جس کو من و عن پیش کیا جاتا ہے، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عمر مجید کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا کہ وہ ایک طویل عرصہ تک افسانوی منظر نامے سے غائب رہے۔

ٹھیک دس سال بعد آپ کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں یا شاید دس جنموں کے بعد کچھ ٹھیک یاد نہیں۔ یادوں کے الاؤ سے اٹھنے والا ملگجی دھواں، جہلم کے سینے پر دُھند کی دبیز تہہ، ڈل کے پیلے زرد آئینے، شالیمار کے زہریلے آبگینے، زبرون پہاڑی کے بھیانک سایے، ننگا پربت کی بے رحم سنگلاخ عمودی چٹانیں، گلمرگ کی اداس وادیاں، سونہ مرگ کی سیاہ کالی برف، جہنم کی آگ، دس برس، دس جنم، یہ دس جنم کیسے بیتے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ٹھیک دس برس پہلے میں دسویں جماعت کے طلبہ کو اقبالؔ کا تصورِ انسانیت پڑھا رہا تھا۔ مردِ مومن کے اوصافِ حمیدہ بیان کر رہا تھا، بچے انہماک سے سُن رہے

تھے کہ اچانک لالچوک میں گھنٹہ گھر کے قریب ایک زبردست دھماکہ ہوا اور پھر گولیوں کی گھن گرج میں سبق کو اُدھورا چھوڑ کر باہر آیا، سکول کا داخلی دروازہ بند کیا جا چُکا تھا۔ ایک زخمی شخص جس کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا دروازے کے پاس لیٹا کراہ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس ادھیڑ عمر کے زخمی شخص کو تقریباً گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ وہ زندہ تھا لیکن خون کی سُرخ لکیریں اس کی داڑھی کے بالوں کو رنگین کرتی جا رہی تھیں اور پھر...... اُس شخص نے میری گود میں دم توڑ دیا۔ میں اُسے پہچان چُکا تھا۔ وہ عبدالخالق تھا، ہمارے محلے سونہ وار کا خالق حجام عبدالخالق ...... ایکسی لنٹ ہیر کٹنگ سیلون کا مالک۔ کسی کام سے لالچوک آیا ہوا تھا۔ طاقتور بم کا ایک بڑا سا ٹکڑا ٹھیک اس کے سر کے پیچھے لگا تھا۔ عبدالخالق نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے مرتے دیکھا تھا پھر پولیس آئی، لاش کو اُٹھا کر لے گئی اور میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو تازہ بہتے ہوئے خون میں نہا چکے تھے اُس رات میں بالکل نہ سو سکا اور دوسرے دن سکول بھی نہ جا سکا۔ خاموش پڑا عبدالخالق کے بارے میں سوچتا رہا کئی راتیں بیت گئیں کئی دن بیت گئے۔ میں اپنے آپ کو خالی خالی سا محسوس کرنے لگا۔ اسی حالت میں ایک ہفتہ گذر گیا فاطمہ پریشان، نوشابہ حیران یہ پاپا کو کیا ہو گیا؟ قلم، کتاب، نماز سب کچھ چھوٹ گیا اور پھر مجھے ایسا لگا میں بہت بیمار ہوں۔ مصیبت کی راتیں میرے لئے ٹھہرائی گئی ہیں۔ راتیں لمبی ہوتی گئیں۔ میرا جسم کیڑوں اور مٹی کے ڈھیلوں سے ڈھکنے لگا میرا دل جلا ہے کہ ڈھرکی سے بھی

تیز رفتار اور بغیر اُمید کے گذرنے لگے۔ میری آنکھ خوشی کو نہ دیکھ سکی۔ روح کی تلخی، جان کا عذاب، مستقبل کا غم، میں زندہ تھا لیکن ایک بے گور کفن لاش کی طرح اور پھر یگ بیتے۔ الفاظ جن کے ساتھ میں کھیلا کرتا تھا اور جو میری لونڈی تھے میرے لئے اجنبی بن گئے۔ ایکسیلنٹ ہیر کٹنگ سیلون کا مالک عبدالخالق کو اس کے خون میں لت پت چہرے کو بھلا نہ سکا۔ وہ بچپن میں میرے بال کاٹتا ہوا آیا تھا۔ پھر ایک دن جب اسے پتہ چلا کہ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ میں الٹی سیدھی کہانیاں بھی لکھتا ہوں تو اُس نے مجھ سے کہا میری بھی کہانی لکھئے میں تمہیں اپنی کہانی سناتا ہوں اور اُس نے مجھے اپنی کہانی سُنائی اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہر شخص اپنی ذات میں ایک افسانہ ہے۔ ناول ہے ایک پیچیدہ افسانہ، تہہ در تہہ، افسانہ در افسانہ، عبدالخالق ہر رات ساڑھے آٹھ بجے ریڈیو پاکستان سے خبریں سُنتا تھا کشمیر اس کی پہلی محبت تھی۔ میں اب بھی دَر دَر بھٹک رہا ہوں۔ اپنا خالی کشکول لئے کہ شاید کوئی میرا مسیحا بن کر میرے درد کو سمجھے۔[1]

جب ایک حساس انسان کے ساتھ ایسا حادثہ پیش آئے تو اس کا حواس باختہ ہونا قدرتی بات ہے۔ اس دلدوز سانحہ کے بعد عمر مجید کی دنیا ہی بدل گئی، تو انہوں نے ایسے ہی موضوعات کو کہانی میں پروتے ہوئے ''افسانوی شہر آشوب'' کی بنیاد ڈالی۔ جس کا اعتراف معروف افسانہ نگار دیپک بدکی کھلے دل سے کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

[1] (ہفتہ روزہ کشمیر عظمیٰ، ۲۰ تا ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴، جلد ۲۔ شمارہ ۵۱)

''وادیٔ کشمیر گزشتہ اٹھارہ سال سے جس دورِ آشوب سے
گزر رہی ہے اس نے عمر مجید کی کہانیوں میں ایک نئی سمت اور
وسعت بخشی ہے، شہر کے سناٹے، دوستوں کی کسمپرسی اور نہتے
معصوموں کی شہادت نے ان کے حساس ذہن کو مقتل کر کے رکھ
دیا ہے، اسی کرب کا نتیجہ میری گلی کا غم، شہر کا اغوا، محمد شمیم کو کشمیر
جانا ہے جیسے شاہکار افسانے ہیں۔ کشمیر کے موجودہ حالات پر
ان سے بہتر افسانے شاید ہی کسی نے رقم کیے ہیں۔''[1]

عمر مجید کے کئی ایسے پہلو ہیں جن پر بات ہو سکتی ہے لیکن میں نے کچھ ضمنی نقاط کی طرف نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے میں اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں، وہ حساس قارئین عمر مجید کی کہانیاں پڑھ کر بتا سکتے ہیں۔ مجھے عمر مجید کے ساتھ کیا ہوا وعدہ ایفاء ہونے پر ایک طرح کی طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ ایک جنیوئن تخلیق کار کا سرمایہ آنے والی نسل کے لئے محفوظ ہوا۔

سلیم سالکؔ

[1]: (جموں و کشمیر میں اردو افسانہ... ماہنامہ 'شاعر' مئی ۲۰۰۹ صفحہ ۳۴)

میری گلی کا غم

محلے کی بڑی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو چکی ہے لیکن جس گلی میں میرا گھر ہے وہ سونی پڑی ہے۔ میلی میلی سی صبح...... خزاں کی صبحیں ایسی ہی ہوتی ہیں شاید۔ خاموش خنک، کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے...... بس لحاف کے اندر...... دُبک کر، چھت کی کڑیوں کو گننا اچھا لگتا ہے۔

لوگ ابھی سو رہے ہیں جیسے انہیں چولہا نہ جلانا ہو۔ ناشتہ نہ کرنا ہو، کام کاج کے لئے نہ نکلنا ہو۔ امام صاحب نے نماز عشاء پر اعلان کیا تھا کہ کل محلے کی بڑی گلی میں دکانیں بند رہیں گی۔ ''یعقوبؔ'' کی موت کے غم میں، جسے کل سہ پہر بڑی گلی کی نکڑ پر سیکورٹی فورسز نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

امام صاحب نے صرف دُکانیں احتجاج کے طور پر بند کرنے کے لئے کہا تھا لیکن لوگوں نے عام ہڑتال سمجھ کر دُکانوں سمیت دیگر کاروبار بھی بند کرنا سمجھ لیا ہے۔

سب لوگ سو رہے ہیں، صرف میں آئینے کے سامنے شیو بنا رہا ہوں۔ آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ آج میرا اسلیکشن ہونے والا ہے،

مجھے آج اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا تاکہ میں راجدھانی میں منعقد ہونے والے کرکٹ کے تربیتی کیمپ میں شامل ہونے کے لئے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دوں۔ کیمپ میں بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو ملک کی قومی کرکٹ ٹیم میں شامل کئے جانے کے روشن امکانات ہیں۔ اسلئے آج کا دن میرے لئے نہایت اہم ہے۔ میرے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے آج مجھے ہر دم تازہ دم نظر آنا چاہئے۔ چست چالاک اسی لئے میں اہتمام کے ساتھ شیو بنا رہا ہوں ورنہ میں اس قدر پابندی اور صفائی کے ساتھ شیو نہیں بنایا کرتا۔

میں نوجوان ہوں لیکن مجھے اپنے اندر کسی بھی قسم کا اُبلتا ہوا لاوا نظر نہیں آتا، نہ آگ، نہ تپش، نہ تمازت، نہ حرارت، صرف راکھ کا ایک ڈھیر، جس میں نہ شعلہ ہے نہ چنگاری میں جانتا ہوں کہ بچپن بذاتِ خود معصومیت ہے، جوانی بذاتِ خود ایک حسن اور بڑھاپا بذات خود ایک دائمی بیماری ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے لیکن میں جب شام کو تھکا ماندہ گھر لوٹتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی ریٹائرڈ سکول ماسٹر ہوں۔ تھکے تھکے سے قدم، بوجھل سانسیں، غمزدہ مسکراہٹ، میں بھول جاتا ہوں کہ میں بے اے فسٹ ایئر کا طالب علم ہوں۔ ایک عمدہ گیند باز، تیز رفتار، ایکوریٹ، نپی تلی گیند پھینکنے والا۔ میرے دوستوں اور افراد خانہ کا پختہ خیال ہے کہ اگر مجھے صحیح تربیت ملے تو میں ملک کا ایک مایہ ناز گیند باز بن سکتا ہوں۔

''یعقوب'' ...... مجھے یعقوب بار بار یاد آ رہا ہے۔ غوث چاچا کا پوتا، اخروٹ کی لکڑی کی رنگت لئے ہوئے بال، لمبے اُلجھے ہوئے، نیلے رنگ کی

میری گلی کا غم

محلے کی بڑی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو چکی ہے لیکن جس گلی میں میرا گھر ہے وہ سونی پڑی ہے۔ میلی میلی سی صبح......خزاں کی صبحیں ایسی ہی ہوتی ہیں شاید۔ خاموش خنک، کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے......بس لحاف کے اندر......دُبک کر، چھت کی کڑیوں کو گننا اچھا لگتا ہے۔

لوگ ابھی سو رہے ہیں جیسے انہیں چولہا نہ جلانا ہو۔ ناشتہ نہ کرنا ہو، کام کاج کے لئے نہ نکلنا ہو۔ امام صاحب نے نماز عشاء پر اعلان کیا تھا کہ کل محلے کی بڑی گلی میں دکانیں بند رہیں گی۔ ''یعقوب'' کی موت کے غم میں، جسے کل سہ پہر بڑی گلی کی نکڑ پر سیکورٹی فورسز نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

امام صاحب نے صرف دُکانیں احتجاج کے طور پر بند کرنے کے لئے کہا تھا لیکن لوگوں نے عام ہڑتال سمجھ کر دُکانوں سمیت دیگر کاروبار بھی بند کرنا سمجھ لیا ہے۔

سب لوگ سو رہے ہیں، صرف میں آئینے کے سامنے شیو بنا رہا ہوں۔ آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ آج میرا اسلیکشن ہونے والا ہے،

مجھے آج اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا تا کہ میں راجدھانی میں منعقد ہونے والے کرکٹ کے تربیتی کیمپ میں شامل ہونے کے لئے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کردوں۔ کیمپ میں بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو ملک کی قومی کرکٹ ٹیم میں شامل کئے جانے کے روشن امکانات ہیں۔ اسلئے آج کا دن میرے لئے نہایت اہم ہے۔ میرے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے آج مجھے ہر دم تازہ دم نظر آنا چاہئے۔ چست چالاک اسی لئے میں اہتمام کے ساتھ شیو بنا رہا ہوں ورنہ میں اس قدر پابندی اور صفائی کے ساتھ شیو نہیں بنایا کرتا۔

میں نوجوان ہوں لیکن مجھے اپنے اندر کسی بھی قسم کا اُبلتا ہوا لاوا نظر نہیں آتا، نہ آگ، نہ تپش، نہ تمازت، نہ حرارت، صرف راکھ کا ایک ڈھیر، جس میں نہ شعلہ ہے نہ چنگاری میں جانتا ہوں کہ بچپن بذاتِ خود معصومیت ہے، جوانی بذاتِ خود ایک حسن اور بڑھاپا بذات خود ایک دائمی بیماری ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے لیکن میں جب شام کو تھکا ماندہ گھر لوٹتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی ریٹائرڈ سکول ماسٹر ہوں۔ تھکے تھکے سے قدم، بوجھل سانسیں، غمزدہ مسکراہٹ، میں بھول جاتا ہوں کہ میں بی اے فسٹ ایئر کا طالب علم ہوں۔ ایک عمدہ گیند باز، تیز رفتار، ایکوریٹ، نپی تلی گیند پھینکنے والا۔ میرے دوستوں اور افراد خانہ کا پختہ خیال ہے کہ اگر مجھے صحیح تربیت ملے تو میں ملک کا ایک مایہ ناز گیند باز بن سکتا ہوں۔

''یعقوب'' ...... مجھے یعقوب بار بار یاد آ رہا ہے۔ غوث چاچا کا پوتا، اخروٹ کی لکڑی کی رنگت لئے ہوئے بال، لمبے اُلجھے ہوئے، نیلے رنگ کی

آنکھیں ادھر ہمارے ہاں بہت کم لوگوں کی آنکھیں اتنی گہری تیز، اتنی خوابیدہ اور اتنی روشن ہوتی ہیں، اُس کے باپ محمد افضل کی آنکھیں سیاہ رنگ کی تھیں لیکن میں نے اپنی ماں کو کہتے سنا ہے کہ اُس کی دادی کی آنکھیں گہرے سبز رنگ کی تھیں۔

سکول سے گھر لوٹ رہا تھا، گلی میں داخل ہوا تو ایک مشروب کے خالی ڈبے سے پاؤں ٹکرایا...... پہلی ٹھوکر مزے دار نہ تھی ...... دوسری ٹھوکر مارنے کے لئے جی نے اُکسایا۔ خالی ڈبہ اڑ کر قریب کے بنکر کے باہر ایک پہرے دار کے سینے سے ٹکرایا...... پہرے دار بدحواس ہوا۔ اُس نے بندوق کا گھوڑا دبایا......اور یعقوب!!

دراصل بہادر نظر آنے والا ہر شخص ازلی بزدل ہوتا ہے۔ اسے دو چیزوں کا ڈر لگا رہتا ہے، کوئی اُس سے اُس کی طاقت چھین نہ لے، اور اُس کا دشمن اُس پر غالب نہ آئے۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اپنے مدمقابل پر اپنی بھرپور طاقت سے وار کرتا ہے۔ سپاہی نے مشروب کا خالی ڈبہ ہوا میں اپنی طرف تیرتے ہوئے آتے دیکھا تو چوکنا ہو گیا۔ اس ڈر سے کہ اُس پر کوئی خطرناک چیز پھینکی ہے۔ اُس نے جوابی کاروائی کی اور یعقوب کے سینے کے سُرخ باغ میں ایک گہرا سوراخ پیدا ہوا اور اُس میں سے خون کا فوراہ پھوٹ پڑا۔

سات بج رہے ہیں۔ گلی اب بھی سناٹے کی چادر میں لپٹی ہوئی خاموشی کے نغمہ سنا رہی ہے۔

ماں نمکین چائے کا پیالہ اور ایک نان میرے سامنے رکھتی ہے۔" جانا ضروری ہے"۔

"ہاں ماں آج سلیکشن ہے"۔ ماں ایک گہری سانس لے کر رہ جاتی ہے۔ میں روٹی کو چائے میں بھگو کر نوالہ توڑتا ہوں۔ نام بھی ہوگا، کام بھی ملے گا۔ اچھی کارکردگی دکھانے پر نوجوان کھلاڑیوں پر اشتہاروں کی بھر مار ہو جاتی ہے۔ ایک ایک ایڈ فلم میں کام کرنے پر لاکھوں روپے مل جاتے ہیں اور اپنے ملک میں تیز گیند بازوں کا ہمیشہ کال رہتا ہے۔ کیا معلوم قسمت چمکے۔ سب غم دور ہوں گے، گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولتا ہوں۔ غوث چاچا کے گھر میں تعزیت کرنیوالے ایک ایک کر کے داخل ہو رہے ہیں۔ سفید وردی پالی تھین کے لفافے میں ڈال کر باہر آتا ہوں۔ گلی میں ماتم ہے۔

چور نظروں سے غوث چاچا کے مکان کو دیکھتا ہوں۔ مکان منہ بسورے نظر آرہا ہے۔ یہ شاید میرا واہمہ ہے، سب مکان جن پر رنگ وروغن کی چادر نہ چڑھائی گئی ہو ایسے ہی منہ بسورے کھڑے نظر آتے ہیں۔ انسان کی موت کا مکان کی بناوٹ سے کیا کام؟ گلی کی ہر شئے اُداس اُداس نظر آتی ہے۔ دو فرلانگ لمبی گلی، ایک ایک قدم اُٹھانا بھاری ہو جاتا ہے۔ ماتم بس گلی کے نکڑ تک ہے نکڑ کے اُس پار زندگی رواں دواں ہے۔ وہاں کوئی ماتم نہیں، پہلے کوئی اس طرح مارا جاتا تھا تو شہر کی ہر گلی میں ماتم منایا جاتا تھا۔

بہت دنوں تک ماتم کرتے کرتے ہم تھک گئے تو اب ماتم صرف اپنے محلے کی خاص گلی تک محدود ہو کے رہ جاتا ہے۔ تاریخ اسی طرح بدل جاتی ہے

اور زندگی اسی طرح دوڑتی بھاگتی ہے۔ موسم اسی طرح بدلتے ہیں۔

غوث چاچا، بڑے ملنسار شخص ہیں، ہر کسی کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، پُرسہ، ماتم، آنسو ہمیشہ پیش پیش۔ تمبا کو بہت اُڑاتے ہیں۔ اپنی تمبا کو کی پڑیا ہمیشہ ''پشاور تمبا کو سٹور'' سے خریدتے ہیں جو گلی سے باہر آتے ہی مین روڈ پر واقعہ ہے۔ مامہ کلو تمبا کو فروش سے اُس کی گاڑی چھنتی ہے۔ دونوں دوست راز و نیاز کی باتوں میں گھنٹوں بتاتے ہیں۔ ایک دن میں چٹکی پان مصالحہ خریدتے مامہ کلو کی دُکان پر پہنچا تو غوث چاچا مامہ کلو سے کہہ رہے تھے۔

جانتے ہو مامہ دُنیا کی سب سے سخت چیز کیا ہے؟ نہیں جانتے! میں بتاتا ہوں، لوہا اور لوہے سے سخت؟...... نہیں معلوم...... میں بتاتا ہوں۔ لوہے سے بھی سخت چیز آگ ہے جو لوہے کو پگھلا دیتی ہے اور آگ سے بھی سخت چیز پانی ہے جو آگ کو بجھاتی ہے اور پانی سے بھی زیادہ سخت چیز ہوا ہے۔ جو پانی کو دھکیلتی ہے۔ پانی سے بھی سخت چیز سمندر ہے جس سے بھاپ اُٹھتی ہے۔ سوئے آسمان جاتی ہے اور بارش برساتی ہے۔ سمندر سے بھی سخت سورج ہے جس کی تمازت سے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اُڑتا ہے لیکن ان سب چیزوں سے سخت غم ہے، جو انسان کے دل کو کاٹتا ہے۔ آج دو پڑیاں دو، آج نذیر اور اُس کی ماں دونوں خواب میں دیکھے تھے۔

نذیر اُس کے بیٹے کا نام تھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ میں ملازم تھا۔ ٹرک چلاتا تھا، لوہا لے کر لداخ جا رہا تھا، برفانی تودے نے گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا پھر لداخ کا راستہ بھاری برف کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اگلے برس برف

نے پگھلنا شروع کیا تو نذیرا اپنے ٹرک سمیت ایک کھائی میں پڑا ہوا نظر آیا۔

میں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے محلے کی بڑی گلی سے گزرتا ہوں لیکن ہر قدم پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گلی کا غم مقناطیس بن کر میرے پاؤں کو زمین کی طرح کھینچ رہا ہے۔ سامنے سے ایک جلوس آرہا ہے، ایک خاتون لیڈر شاید غوث چاچا کو پُرسہ دینے کے لئے گلی میں داخل ہو رہی ہے۔ سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ کے ساتھ ہے۔

''بنکر ہٹاؤ......نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

یہ بنکر بہت برس پہلے گلی کے نکڑ پر بنوایا گیا تھا۔

خاتون لیڈر کے بعد غوث چاچا کو پُرسہ دینے کے بعد شاید سرکاری نمائندہ آئے گا۔

''سرکار آپ کے غم میں برابر کی شریک ہے، سرکار کی طرف سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دلدوز واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات ہوگی اور ملزم کو پوری کی پوری سزا ملے گی''۔ سرکاری ترجمان کے بعد کوئی اور لیڈر آئے جب تک ہمارا فیصلہ نہیں ہوگا تب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ بے گناہ مارے جاتے رہیں گے۔

''میری گلی کا غم کیا ہے؟''

میں سوچتا ہوں، روٹی، روزی، بجلی، پانی، کوئلہ، یا کچھ اور......!!

قدم وزنی ہوتے جا رہے ہیں۔ آگے بڑھنے کی تمام قوت زائل ہوتی جا

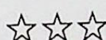
رہی ہے۔ دل پچھلے پہر کے چاند کی طرح بجھ جاتا ہے۔ میں گلی عبور کر چکا ہوں۔ مین روڈ پر نکل آیا ہوں، یہاں سے یونیورسٹی کیمپس کے لئے مجھے بس پکڑنی ہے۔ ''پشاور تمباکو سٹور''۔

سڑک پر زندگی رواں دواں ہے۔ میں مامہ کلو کی دُکان کی طرف قدم بڑھاتا ہوں، نہ چاہتے ہوئے بھی میں مامہ کلو سے کہتا ہوں:

''دو پڑیاں، تمباکو، بھاری ہلکا ملا کے''

''آج پان مصالحہ نہیں!'' ''نہیں''

میں واپس مڑتا ہوں، گلی پہلے کی طرح غمزدہ ہے، میں تھکے تھکے سے قدم غوث چاچا کے گھر کی دہلیز کی طرف بڑھاتا ہوں۔ اکثر منزلیں اسی طرح، اچانک بدل جاتی ہیں اور راستے ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔



شہر کا اغوا

یہ کونسی جگہ ہے۔ یہ کیسی خاموشی ہے۔ یہ ویرانی کا عالم، یہ ڈرا دینے والی خاموشی یہ مکان یہ دُکانیں یہ سڑکیں خالی کیوں ہیں؟ اس شہر میں رہنے والے لاکھوں لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ یہ شہر جہاں زندگی متحرک تھی۔ جہاں اضطراب تھا۔ بھاگتی ہوئی بسیں اور موٹریں تھیں سچ تھا، جُھوٹ تھا، محبت تھی، نفرت تھی، وفا تھی، دغا تھی ..... لوگ ہر وقت تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگتے رہتے تھے' وہ سب کہاں ہیں؟ یہ ماجرا کیا ہوا ہے؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں پاگل تو نہیں ہوا ہوں ..... نہیں یہ خواب نہیں۔ حقیقت ہے۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں ..... میں دینا ناتھ ہوں۔ ٹیلی فون مستری ..... مگر اس بڑے پھیلتے ہوئے شہر کے مکین کہاں چلے گئے ہیں۔ یہ شہر خالی کیوں ہو گیا ہے؟ یہ کارخانے، یہ دفاتر، یہ سکول، یہ ہوٹل، یہ پارکیں، یہ سڑکیں خالی کیوں ہیں؟ سنسان ویران، سناٹے کی چادر میں لپٹا ہُوا یہ شہر نہ کہیں انسان نظر آرہا ہے نہ حیوان ..... نہ چرند نہ پرند' یہ وہی سڑک ہے نا جس پر ہر وقت

بے شُمار کُتے بھونکتے رہتے تھے۔ وہ کہاں غائب ہوگئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر تو وہ زیادہ ہی شور مچایا کرتے تھے...... میں کسی خطرناک بیماری کا شکار تو نہیں ہُوا ہوں...... میری آنکھوں کی روشنی تو نہیں چلی گئی ہے...... نہیں ایسا ہُوا ہوتا تو مجھے یہ مکان، یہ دُکانیں نظر نہ آتیں...... پھر...... یہ کیا معاملہ ہے؟ میں اس بڑے شہر میں اکیلا کیوں رہ گیا ہوں کیا میرے سوا اس شہر میں اور کوئی نہیں......؟ نہیں یہ میرا وہم ہے۔ میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ سب اسی شہر میں ہیں۔ کوئی شہر چھوڑ کر نہیں چلا گیا ہے۔ مگر کہاں ہیں سب...... مُجھے نظر کیوں نہیں آتے' شاید وہ مجھ سے چھپے ہوئے ہیں۔ ہاں یہی بات ہے۔ لگتا ہے میں نے کوئی بدترین گناہ کیا ہے۔ لوگ میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتے۔ اِسی وجہ سے وہ مُجھ سے چُھپ رہے ہیں۔ میرے سائے سے ڈر رہے ہیں۔ میرے وجود سے خوفزدہ ہیں۔ شاید میرے جسم کو کوڑھ نے اپنی لَپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور اب میں درد کی چادر پھیلائے دردر بھیک مانگتا پھر رہا ہوں۔ لیکن میرے نصیب میں نفرت کے سِوا اور کچھ نہیں۔ اِسی لئے لوگ مجھ سے دُور بھاگ رہے ہیں۔ مُبادا کہ میری پرچھائیاں اُنہیں چھُولیں۔ وہ...... وہ اس دیوار کے ساتھ لگ کر کوئی کھڑا ہے۔ ارے بھائی...... شاید کوئی عورت ہے۔ سنو...... دیوی...... ماں...... بیٹی، خدا کے لئے ایک منٹ رُکو...... دیکھو بھاگو مت...... مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... ماں۔ کہاں چلی گئی۔ ابھی ابھی تو یہاں تھی۔ شاید کوئی نہ تھا...... وہم...... سایہ۔ میرا دم گُھٹ رہا ہے۔

''لوگو..... اے اس بڑے شہر کے لوگو! سامنے کیوں نہیں آتے' باہر آؤ۔ مجھ سے ڈر کیوں رہے ہو...... میں پاگل نہیں۔ کاٹتا نہیں۔ لوگو! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں دینا ناتھ ہوں۔ ٹیلی فون مستری...... میں تمہارے ٹیلی فون ٹھیک کرتا ہوں۔ تم نہ رہے تو میں کس کے لئے ٹیلی فون ٹھیک کروں گا۔ میں تمہارے بغیر بے کار ہوں۔ جس طرح تمہارے ٹیلی فون میرے بغیر بے کار ہیں۔ لوگو...... تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔

میں فضول چیخ رہا ہوں۔ اس شہر میں میری آواز سُننے والا نہ کوئی تھا اور نہ اَب ہے۔ پہلے پہل میں اُنہیں نظر نہ آیا کرتا تھا۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آتے۔ شاید سب لوگ غائب ہو گئے ہیں۔ شاید دشمن ملک نے حملہ کر دیا ہے۔ اور اُس نے نئے بم کا استعمال کیا ہے۔ جس سے صرف جاندار مر جاتے ہیں۔ ہَوا میں ذرّے بن کر تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یا ایسا لگتا ہے' جیسے کسی جادوگر نے اُنہیں چشم زدن میں غائب کر دیا ہو۔ لیکن اس خلائی دور میں جادوگر کہاں۔ یہ کم بخت سائینس دان بھی تو جادوگر ہی ہوتے ہیں۔ ان کا کیا بھروسہ ہاں شاید یہی ماجرا ہوا ہے۔ اس شہر کا ہر شخص، ہر جاندار، ہر ذی رُوح، ایٹمی ذرات میں تبدیل ہُو چکا ہے۔ نظر نہ آنے والے ذرّوں میں پہلے اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا بے چہر گی کا رونا رو رہا تھا اب سِرے سے ہی غائب ہو گیا ہے۔ انسان...... مگر میں کِس طرح بچ نکلا ہوں۔ میں اُس وقت کہاں تھا۔ میں دینا ناتھ، ایک ٹیلی فون مستری' ہاں یاد آیا شاید اُس وقت زمین کے سینے میں ٹیلی فون کے تاروں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ہاں شاید یہی بات ہے' اسی وجہ سے

میں بچ رہا۔ میرے ہاتھوں میں لگی ہوئے کا لک...... یہ تاروں کے جلنے کی بُو میرے ہاتھ کتنے گندے ہیں۔ مجھے یہ صاف کرنے چاہیں۔ بھوک بھی محسوس ہورہی ہے۔ وہ سامنے ایک ہوٹل نظر آرہا ہے۔ یہ وہی ہوٹل ہے، جو ہر وقت لوگوں سے بھرا نظر آتا تھا۔ جسے دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ دُنیا میں غم نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے۔ تو سوئمینگ پول کا بلوریں پانی ہے اور اس میں تیرتے ہوئے مرمریں بدن ہیں۔ ڈانس فلور پر تھرکتی ہوئی جوانیاں ہیں۔ سنہری دُھوپ ہے نیلا آسمان ہے۔ لیکن اس وقت یہ عالی شان ہوٹل زندگی کی طرح خالی نظر آرہا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل...... ایک سو کمرے' آج یہ ہوٹل خاموش ہے۔ خالی ہے۔ نہ دربان' نہ بیرے' نہ بارٹینڈر نہ بینڈ' نہ بل...... ہائے اس مخملی صوفے پر بیٹھنے کی کس قدر چاہ تھی۔ بس اب سر پَر پاؤں پسار کر سو جانا چاہئے۔ ایک لمبی میٹھی نیند میں نہ جانے کب سے جاگ رہا ہوں...... پہلے مجھے کھا پی لینا چاہئے۔ میں پیاسا بھی ہوں۔ اس چمکتے ہوئے فرج میں ضرور' کوئی ٹھنڈا مشروب ہوگا...... ہاں یہ تو نعمتوں سے بُھرا پڑا ہے۔

''دینانا تھ تو کس قدر خوش نصیب ہے۔ ہاتھ بڑھا۔ اُٹھا جو کچھ تجھے پسند ہے' اس وقت نہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ بل مانگنے والا نہیں۔ یہ خوشبودار سیب' جنہیں دیکھتے ہی بھوک مِٹ جاتی ہے۔ یہ رنگ دار کیک، تمہارے بچپن کے خوابوں سے بھی زیادہ حسین...... اُٹھا...... ڈر کیا رہا ہے؟ زندگی بھر تو ڈر اور خوف کی دنیا میں مر مر کے جیا ہے...... آج تو اکیلا ہے۔ ہاتھ بڑھا ڈر کیوں رہا ہے؟

پیاس بڑھتی جا رہی ہے۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔ مُنہ سے معدے تک کانٹوں کا جال بچھا جا رہا ہے۔ کیک اس طرح نہ کھایا جا سکے گا۔ پہلے ٹھنڈے سادہ پانی کا ایک گلاس پی لینا چاہئے۔ یہ نل ہے۔ یہ رہا گلاس، لیکن یہ پانی......! کیا یہ پینے کے لائق ہے۔ کہیں اس میں وہ ایٹمی قوّت تو نہیں۔ جس سے اس شہر کے سب لوگ غائب ہو گئے ہیں۔ کسی کمبخت سائنس دان نے پینے کے پانی میں کچھ ملا دیا ہے۔ میں اس پانی کو کسی بھی صورت میں نہیں پی سکتا۔ میری زندگی اتنی سستی نہیں، میں پانی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔ میری کونسی پیاس اب تک بُجھ سکی ہے جواب بُجھے ...... میں ہمیشہ سے ہی بھوکا، ننگا اور پیاسا ہوں...... آج میں اس شہر کا مالک ہوں۔ شہر خالی پڑا ہے۔ اس کی ایک ایک چیز میری ہے۔ یہ فائیو سٹار ہوٹل...... اس کی کیا حقیقت ہے؟ یہ بُو...... یہ کیسی بُو آ رہی ہے۔ شاید کہیں بجلی کے تاروں نے آگ پکڑ لی ہے۔ مگر نہیں...... یہ بُو میرے کپڑوں سے آ رہی ہے۔ مجھے اپنے کپڑے تبدیل کر لینے چاہیں۔ یہ خاکی زین کی وردی...... کیا زندگی بھر میرے جسم سے چپکی رہے گی۔ مجھے اس ریڈی میڈ کپڑوں کی دُکان میں داخل ہونا چاہئے۔ کس قدر پھیلی ہوئی دکان ہے یہ۔ اس کے سامنے سے جب بھی میں گُزرتا تو لگتا تھا کہ اس کے دِلفریب شوکیسوں کی طرف دیکھ کر مجھ سے کوئی بہت بڑا گُناہ سرزد ہو رہا ہے۔ لیکن اس وقت خالی ہے، مینجر نہ سیلز مین۔ اب اس شہر کی سب سے بڑی اور سب سے مہنگی دکان کا مالک میں ہوں۔ یہ رہا ٹیری وول، یہ پالِسٹر، ایٹ ٹونٹی، یہ ہلکی گُلابی رنگت لئے ہوئے قمیض اور یہ نیلی

جین، میرے سائز کے ہیں......'' تمہارا سائیز کیا ہے دینا ناتھ؟ پتلون کی لمبائی ۴۲ انچ، کمر ۳۸/ انچ اتنا بڑا ہو گیا ہے تو۔ اَرے دینا ناتھ تو اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ تُو تو اپنے آپ کو بہت چھوٹا آدمی سمجھتا تھا۔ تو یکا یک اتنا بڑا آدمی کیسے بن گیا۔ لیکن ایک بات بتا تو اگر اس شہر کا سب سے بڑا آدمی بن گیا ہے تو تجھ سے چھوٹا کون ہے؟ ایں......کوئی نہیں۔ اس شہر کے لوگ غائب ہو گئے ہیں۔ یہ شہر تو لوگوں سے خالی ہے۔ اب تو سب سے بڑا آدمی کیسے ہوا؟ یہ گُلابی قمیض پہننے سے کیا فائدہ...... کس کے لئے۔ کون ہے یہاں جِسے دکھانے کے لئے یہ خوبصورت اور قیمتی کپڑے پہنے گا۔ کِسے رشک ہوگا۔ کون حسد کی آگ میں جلے گا۔ دینا ناتھ اس دُنیا میں سب کچھ دکھاوے کے لئے ہوتا ہے' ورنہ ضرورت تو خاکی زین سے بھی پُوری ہوتی ہے۔

''ارے ہاں میں تو بھوُل ہی گیا تھا۔ یہ کپڑے پہننا فضوُل ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اس بینک میں داخل ہو جاؤں۔ اس مین لاکھوں کروڑوں روپے ہیں۔ لوگ تو اس شہر کے غائب ہو گئے ہیں۔ باقی دُنیا تو آباد ہوگی۔ کسی دوسرے شہر میں ایک نئی زندگی شروع کی جا سکتی ہے۔ ایک نئی خوبصورت دنیا جس میں نیلا آسمان ہوگا۔ سویمنگ پول کا بلورین پانی ہوگا۔ اور......اور......ابھی تھوڑی دیر قبل میرا بنک بَیلنس کتنا حقیر تھا۔ پانچ روپے دس پیسے اور اب......! ایک ہزار ایک لاکھ، ایک کروڑ، ارب، کھرب، نیل پدم، سنکھ اب میں اپنی ہر پیاس بُجھا سکوں گا۔ میں اب نہ بھوکا رہوں گا۔ نہ پیاسا...... پانی...... پیاس......مُنہ سے معدے تک نہیں رُوح کے ہر گوشے

میں اور دل کے ہر ٹکڑے میں کانٹوں کا جال بچھا جا رہا ہے۔ یہ پانی ......ٹھنڈا، شیریں ماں کے دودھ کی طرح، ماں......ماں......میں بہت پیاسا ہوں...... میں ماں بہت تھک گیا ہوں ماں مجھے ایک بار صرف ایک بار لوری سُنا دے۔ ہاں ماں۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں......ماں......

پانی پیتے ہی یکا یک دینا ناتھ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا۔ اور ریزہ ریزہ ہو کر ذرات میں تبدیل ہونے لگا۔ پہلے سو، پھر ہزار، پھر لاکھ، پھر کروڑ، پھر ارب، پھر کھرب......

پھر وہ غائب ہو گیا اور جب وہ مکمل طور ہوا میں اور کائنات میں تحلیل ہو گیا۔ تو شہر ایک دم سے جاگ پڑا۔ وہی شور، وہی آوازیں، وہی لوگ تیزی سے بھاگتے ہوئے......شمشان گھاٹ سے واپس آتے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا......" بے چارا دینا ناتھ......سارا جسم کرنٹ سے جل گیا تھا ......بھگوان ایسی موت کسی کو نہ دے!



تلاشی

مہینے کی پہلی تاریخ تھی، میں ابھی ابھی سکول سے لوٹا تھا اور اپنے سامنے کی دیوار پر لٹکے ہوئے کوٹ کی اُس جیب کو دیکھ رہا تھا جس میں میری تنخواہ پڑی تھی۔ دفعتاً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بیوی کسی پڑوسن کے ہاں گئی ہوئی تھی، بچے باہر گلی میں کھیل رہے تھے۔ اسلئے مجھے خود ہی دروازہ کھولنا پڑا۔

میرے سامنے ایک مریل قسم کا آدمی کھڑا تھا جس کی قمیض کے کالر پر بالوں کی خشکی کی ایک تہہ بڑی آسانی کے ساتھ دیکھی جاسکتی تھی۔ اس کے پیچھے ایک موٹا آدمی ایک بے حد تنگ سوٹ میں ملبوس سگریٹ کے آخری ٹکڑے کو جوتے کی نوک سے مسلسل رہا تھا۔

''ویجی لینس کمیشن''! مریل قسم کے آدمی کے پتلے پتلے ہونٹ بڑی تیزی سے ہلے۔ ہم آپ کے مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ کے گھر میں فارین چیزوں کا ایک بھاری اسٹاک موجود ہے۔ آپ ایک بہت بڑے سمگلر ہیں۔ آپ باہر سے قیمتی اشیاء بلا لائسنس سمگل کرتے ہیں۔ یہاں کشمیر میں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔

اور ہمارے پاس باضابطہ سرچ وارنٹ ہے۔اب کی بار موٹا آدمی بولا اور مجھے ایسا لگا جیسا کسی پُرانے پیانو کے موٹے سُر دبائے جارہے ہوں۔

"لیکن......"

دیکھئے مسٹر۔ ہمارے کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش مت کیجئے۔مریل قسم کے آدمی کا لہجہ بڑا سرد تھا۔

دیکھئے جناب! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر کا سب سامان دیسی ہے۔اپنے ملک کا بنایا ہوا، اپنے ملک میں بنا ہوا۔

"آپ کے گھر میں کونسا سامان ہے یہ دیکھنا ہمارا کام ہے اور آپ کے لئے یہی بہتر رہے گا کہ آپ ایک طرف ہٹ جائیں تا کہ ہم اندر داخل ہو سکیں اور اپنا کام شروع کریں!"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور وہ دونوں اُس کمرے میں داخل ہوئے جو بیک وقت کئی کاموں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔کئی کاموں کے لئے کیا، کھانا پکانے کے سِوا ہر کام اسی کمرے میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے سال دو سال کے وقفہ کے بعد بطور لیبر روم بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سُرخ فیتے سے بندھی ہوئی فائل کھولتے ہوئے مریل قسم کے آدمی نے مجھ سے کہا:

"آپ کا نام......"؟

"تعجب ہے آپ کے پاس میرے نام تلاشی کا وارنٹ ہے اور اس کے

باوجود آپ مجھ سے میرا نام پوچھ رہے ہیں''۔

''مسٹر Procedure is Procedure '' آپ سے جو کچھ بھی پوچھا جائے اس کا صحیح جواب دیجئے''۔

''جی بہتر''

''آپ کا نام''

''عبدالعزیز''

''باپ کا نام''

''جناب میرے والد اب دُنیا میں نہیں بھلا وہ اس معاملے میں کیسے ملوث ہوسکتے ہیں۔''

''عبدالعزیز صاحب'' آپ کاروائی کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں اور ہمارا وقت ضائع کررہے ہیں۔اپنے باپ کا نام بتائیے''

''عبدالستار آزاد''

''پیشہ؟''

''کس کا''؟

''آپ کے باپ کا''؟

''مجھے معلوم نہیں''۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تھا تو اُس وقت وہ صرف کھایا کرتے تھے''۔

''انہوں نے آپ کے لئے کیا چھوڑا تھا؟''

''پچاس ہزار روپے قرض''

''اور......''

''گلستان بوستان''

''اور''

''تین جوان بہنیں''

''اور......''

''اور کچھ نہیں''

''یہ مکان جس میں آپ رہتے ہیں کس کا ہے......؟''

''مکان نہیں۔ میں اس مکان کے صرف دو کمروں میں رہتا ہوں اور ہر ماہ چھ سو روپے کرایہ ادا کرتا ہوں''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مکان آپ کا نہیں ہے''۔

''میں نے اب کی بار خاموش رہنے میں اپنی عافیت سمجھی''۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے پاس اپنا مکان نہیں''۔

اب کی بار بھی میں خاموش ہی رہا۔

''آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟''

''جناب میرے خیال میں آپ میری تلاشی لینے کے لئے تشریف لائے ہیں''

''اور ہاں...... یاد آیا۔ اُس صندوق میں کیا ہے؟'' اُس نے کمرے میں رکھے ہوئے واحد صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک

سرد آہ بھری اور پھر کہا"۔

"اس میں میرے خواب بند ہیں"۔

موٹا آدمی صندوق کو کھینچتے ہوئے کمرے کے وسط میں لے آیا۔

"چابی؟"

"کھو گئی ہے"۔

"تالا توڑ دیا جائے؟"

"موٹے آدمی نے تالا توڑنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ مریل قسم کے آدمی نے دوبارہ فائل کھولی اور لکھنے کے لئے تیار ہو گیا"۔

"کاٹن کی دو مرادانہ قمیض۔ ایک کالر پھٹا ہوا۔ اور دوسری کی آستین ندارد۔ دونوں فارین"۔

موٹا آدمی ایک ایک کر کے صندوق میں سے چیزیں نکالنے لگا۔

"یہ میں نے سنڈے مارکیٹ میں خریدی ہیں"۔

"واش اینڈ ویئر کی دو زنانہ قمیض ......"۔

"انہیں فراک کہتے ہیں"۔ میں نے لقمہ دیا۔

"آپ چپ رہیئے"۔

"موٹے آدمی کے ہاتھوں میں اب ایک شلوار تھی"۔

"یہ کس کی شلوار ہے؟"

"میری بیوی کی"۔

"یہ کس کپڑے کی بنی ہوئی ہے"۔ وہ کپڑے کا بغور جائزہ لینے لگا وہ

کپڑے کو کبھی کھینچنے لگتا اور کبھی دبانے لگتا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری بیوی کی ٹانگیں دبا رہا ہو۔ میں کسی ازلی بزدل آدمی کی طرح خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دُبلے آدمی نے لکھا:۔

''ایک زنانہ شلوار، کپڑا نفیس، سلائی اعلیٰ لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا میڈ کیا ہے''۔

موٹے آدمی نے اب کی بار جو ہاتھ باہر نکالا تو اُس میں ایک انگیا لٹک رہی تھی میں نے اُسکی آنکھوں میں ایک ایسی وحشیانہ چمک دیکھی جو ایک مرد کی آنکھوں میں خاص موقعوں پر عود کر آتی ہے۔ وہ انگیا کی کٹوریوں کو وحشیانہ طریقے سے دبا رہا تھا اور یکا یک مجھے ایسا لگا جیسے...... وہ میری بیوی کا..... میں نے سگریٹ کا کش اس زور سے کھینچ لیا کھانستے کھانستے میری آنکھیں اُبل پڑیں۔

''میڈ اِن فرانس''۔

مریل قسم کا آدمی چونک پڑا''۔ تو یہ غیر ملکی ہے یعنی فارین''اور یہ لپ سٹک......''موٹے آدمی کے ہاتھ میں لپ سٹک کا ایک، ایک سنٹی میٹر لمبا ٹکڑا تھا۔ جسے وہ بار بار سونگھ رہا تھا کبھی اپنی ناک کے قریب لے جاتا کبھی ہونٹوں کے قریب نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میری بیوی کے ہونٹ چوم رہا ہو۔ اُس کے ہونٹ بھیگ سے رہے تھے۔

''لگتا ہے امریکی ہے''۔

''جی نہیں جاپانی ہے''۔

''فارین۔ امریکی ہو یا جاپانی۔ مگر ہے فارین''۔

صندوق خالی ہو چکا تھا اور کسی بدنصیب بھکاری کے خالی کشکول کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اب وہ دونوں اُس طاقچے کی طرف متوجہ تھے جس میں کتابیں اور رسالے ٹھونسے گئے تھے۔ موٹا آدمی انہیں ایک ایک کر کے نیچے گرانے لگا۔

گلستان، بوستان، کار مارکس، شب خون، بیسویں صدی، ہدایت نامہ خاوند، اقبال کا فلسفہ خودی، گلزار نسیم، موپاساں، غالب اور تصوف، او ہنری، اِک محل ہو سپنوں کا، ہائے میں لٹ گئی، تاریخ ہند، دولت مند بننے کے ایک ہزار ایک طریقے، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ٹائم میگزین، آج کل، فسانہ عجائب، ایک سرخ کتاب کو دیکھ کر وہ دونوں چونک پڑے۔

"یہ کتاب کہاں چھپی ہے"۔ موٹے آدمی نے مجھ سے پوچھا۔

"اس پر لکھا ہوگا"۔

"وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا"۔

"اور تو تم ......تم ......"۔

"جی ہاں ٹھیک سمجھے۔ میں سب کچھ ہوں۔ ہندو بھی، مسلمان بھی، عیسائی بھی، فاشٹ بھی، انارکسٹ بھی اور الو کا پٹھا بھی......"۔

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی"۔

مریل قسم کا آدمی رپورٹ مکمل کر چکا تھا تو مجھ سے بولا ......"اس پر اپنے دستخط کر دیجیے"۔ اُس نے میری طرف کاغذ اور اپنا قلم بڑھایا قلم بڑا خوبصورت تھا۔ میں نے اُس پر کندہ الفاظ پڑھے وہ دنیا کے ایک امیر ترین ملک کا بنا ہوا پین تھا......!"

☆☆☆

ماتم کے بعد

یہ چند دلنشیں ساعتیں، یہ چند پُرفریب لمحے، انتظار......طویل انتظار کے بعد نصیب ہوئے ہیں۔ ایک سال، بارہ مہینے...... پو پھٹنے سے پہلے جاگو، کتابیں سنبھالو......نوٹس یاد کرو...... میٹرک کا امتحان ہے، خالہ جی کا گھر نہیں۔ یہ کامیابی کی پہلی منزل ہے......۔

انسان زندگی بھر منزلوں کی تلاش میں رہتا ہے لیکن ہر منزل پر پہنچ کر اسے کسی دوسری منزل کی تلاش میں سفر شروع کرنا پڑتا ہے......تلاش در تلاش۔ منزل در منزل۔ سفر در سفر۔ منزل کہاں ہے؟ سفر کا انتھ کہاں ہوگا؟ کب ہو گا؟ سب کو معلوم ہوتے ہوئے بھی کسی کو نہیں معلوم۔ یا دیدہ دانستہ انجان بنا ہوا ہے۔

''میٹرک کے بعد پی یو سی...... کامیابی کی دوسری منزل۔ پانچویں جماعت تک حساب کمزور تھا۔ حساب سیکھنے کے لئے ٹیوشن لینا پڑی۔ تب کہیں جا کر حساب ٹھیک ہوا ورنہ پانچویں جماعت میں ہی اٹکا ہوتا۔ پانچویں جماعت میں ہی اٹکا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ ٹی ڈی سی کے بعد کونسا تیر ماروں گا۔

سوال تیر مارنے کا نہیں۔ منزل پانے کا ہے۔ میڈیکل کالج کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہے۔ ایم، بی، بی، ایس......''

''کیا ایم، بی، بی، ایس' زندگی کی آخری منزل ہے؟

''تم پاگل ہو...... یہ تمہاری سوچ کو کیا ہو گیا ہے......''

میٹرک کے نتائج نکلنے میں بہت دن پڑے ہیں۔لیکن مجھے صرف سات دن کا وقفہ ملا ہے۔ سات دن بعد پی یوسی کا کورس شروع کرنا ہوگا۔ پروفیسر ریاض کیمسٹری پڑھائیں گے۔ پروفیسر گلزار زلوجی اور پروفیسر وانچو......سُنا ہے بڑا سخت آدمی ہے......ہوگا......سات دن کے بعد دیکھیں گے،میرے پاس سات دن ہیں اور سات شاندار فلمیں......مسئلہ ہے تو بجلی کا...... یہ کمبخت بجلی......''۔

''بجلی آ گئی......''۔

ایک پرمسرت چیخ......بنٹی کے امتحانات بھی ختم ہو چکے تھے۔اسکے پاس ڈھائی مہینے خالی پڑے تھے۔کوئی ہوم ورک نہیں......''

''آج بن ہُر دیکھیں گے''

''نہیں مغل اعظم......''

''میں ہندوستانی ہوں......میرے چاہنے والوں نے......''

''ٹپ......!''

کلیجہ پھٹنے کو آیا۔بجلی صرف دو منٹ کے لئے آئی''۔

''جنریٹر......میری ہر سہیلی کے گھر میں جنریٹر ہے......'' کلثوم کے لہجے کی بے بسی سب نے محسوس کی۔اُن کے پاس الہٰ دین کا چراغ نہ تھا۔بجلی پر کافی بحث ہو چکی تھی۔وہ خاموش رہے۔اُمید کا چراغ جلائے۔اُمید کا غلام کس کے پاس نہیں ہوتا''۔

''اب نہیں آئیگی۔''بنٹی سے رہا نہ گیا۔

''ضرور آئیگی''۔ بے بی نے جواب دیا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بن ہُر دیکھو......''

''بن ہُر دیکھتے تو کیا بجلی رہتی......''۔

''بن ہُر، مغلِ اعظم سے زیادہ کامیاب رہی ہے''۔

''لیکن اسکی کامیابی اور بجلی کا کیا واسطہ''۔

اُمید کا چراغ مکمل طور بجھ گیا تو بنٹی نے ٹرانسزسٹر آن کیا۔''ریل حادثے میں ۱۲۰ / افراد ہلاک، بھرے بازار میں بم دھماکہ، سولہ جان بحق، بتیس زخمی......ثانیہ کی رینک برقرار......خبروں کے بعد تبصرہ شروع ہوا۔ اس نے جلدی سے سوئی گھمائی۔

وہ سب باہر نکل آئے۔ گیارہ بجے کے سورج میں نہ تمازت تھی نہ تپش......جیسے اُسے بھی سردی لگ رہی ہو اور زبردستی آسمان میں نکل آیا ہو۔ سڑک کے اُس پار کچی بستی کے میدان میں کرکٹ میچ شروع ہو چکا تھا۔

''ان سب کے امتحانات تو ابھی چل ہی رہے ہیں۔ وہ انور، جو بیٹنگ کر رہا ہے اسلامیہ سکول میں پڑھتا ہے، میں جانتا ہوں اُسے......اور وہ گر بچن، خالصہ سکول میں پڑھتا ہے۔ اس کے تین مضمون باقی ہیں''۔

بجلی......!! ایک اور پُر مسرت چیخ۔

بنٹی کا ہاتھ قریب کے بجلی پوسٹ کی طرف اُٹھا ہوا تھا۔

''لیمپ پوسٹ پر دن کے وقت بھی بجلی جلتی رہتی ہے......''۔

''اس مسئلے پر دھیان دینے کی ضروت نہ سمجھی گئی۔ مغل اعظم کا کیسٹ

واپس نکالا گیا اور بن ہُر کا کیسٹ چڑھایا گیا''

ایک زمانے میں روم دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت تھی''۔

''خاموش فلم دیکھنے دو......''

''رتھوں کی دوڑ کب شروع ہوگی''۔

''ابھی بہت حصہ پڑا ہے''۔

''چارلس ہسٹن نے غضب کی اداکاری کی ہے''۔

بھائی جان نے اپنے دوست سے کہا۔ اسے ہالی وڈ کے تمام بڑے بڑے ہیروز کے نام یاد ہیں۔ شان کونری، راک ہڈسن، ڈین مارٹین، سڈ پوایٹر، اینتھنی کوین......''

اب رتھوں کی دوڑ شروع ہونے والی ہے۔ بنٹی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُمید کا چراغ روشن تھا۔ اب بجلی نہیں جائیگی۔ اگر بجلی چلی گئی تو......بجلی اکثر خاص موقعوں پر ہی چلی جاتی ہے۔

رتھوں کی دوڑ شروع ہوگئی۔ مسالہ کے کالے چمکیلے گھوڑے اور بن ہر کو مارنے کے لئے رتھ سے پہیے میں لگا ہوا چمکیلا نیزہ، اس کی کاٹ......دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

''یہ اس فلم کا ہی نہیں بلکہ ساری فلمی تاریخ کا ایک ایسا سین ہے جو کبھی بھی بھلایا نہ جاسکے گا۔ جانتے ہو اس سین کو پچاس کیمروں کی مدد سے فلمایا گیا۔ دوسو گھوڑے لقمہ اجل بن گئے''۔

''ٹپ''، بنٹی کا دل اچھل کر باہر آیا۔ لیکن بجلی نہیں چلی گئی تھی، صرف وولٹیج

بڑھ گیا تھا۔ ٹرانسفارمر نے وقت پر اطلاع دی تھی۔ سرخ بتی نے اُمید کے چراغ کو روشن رکھا تھا۔

''آواز دھیمی رکھو......'' دروازے پر امی کھڑی تھیں۔ وہ ہمسائیگی سے لوٹی تھیں، سین دلچسپ نہ ہوتا تو کلثوم ضرور خواجہ صاحب کے بارے میں پوچھتی، خواجہ صاحب کی بیٹی نسرین اس کی نہ صرف ہم جماعت تھی بلکہ اچھی سہیلی بھی تھی۔ خواجہ صاحب عرصے سے بیمار تھے۔ رات کو حالت بہت خراب ہوئی تھی۔

''والیوم کم کرنے سے یہ سارا سین کمزور پڑ جائے گا''۔

رتھوں کی دوڑ کا چوتھا چکر شروع ہو چکا تھا۔ مسالہ کے رتھ میں لگے ہوئے گھومتے ہوئے نیزے نے ایک رتھ کا پہیہ کاٹ دیا تھا۔ اب بن ہُر کا رتھ اس تباہ شدہ رتھ کے اُوپر سے گزرنے والا تھا!''۔

''گریٹ سین!''

اچانک دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلا۔ دروازے پر پاپا کھڑے تھے۔ وہ بھی خواجہ صاحب کے ہاں سے لوٹے تھے......ان کے لب ہل رہے تھے۔ لیکن اونچے والیوم کی وجہ سے ان کی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ خود آگے بڑھے۔ رتھوں کی دوڑ ایک دم بند ہوگئی......''۔

''تمہیں شرم آنی چاہئے۔ ہمسائیگی میں ماتم داری ہے اور تم لوگ فلمیں دیکھ رہے ہو''۔

''پاپا......''

''چپ رہو...... خواجہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہیں''۔

پاپا۔ ہمارے ویڈیو نہ دیکھنے سے خواجہ صاحب کی رکتی ہوئی سانسیں دوبارہ واپس نہیں آسکتی ہیں''۔

ایک کرب ناک چیخ نے بھائی جان کو خاموش رہنے پر مجبور کیا۔ کلثوم نے صاف پہچان لیا، یہ نسرین کی امی کی چیخ تھی''۔

انا للہ وانا الیہ راجعون پاپا کا سر جھکتا چلا گیا۔

بھائی جان خواجہ صاحب کے ہاں سے لوٹے تو گھر میں خاموشی کی حکمرانی تھی، گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے......

''پاپا نے منع کیا ہے...... کم از کم تین دن تک ویڈیو، ٹیپ، ٹی وی سب بند......''

''کیا یہ سب ضروری ہے۔ مرنے والے لوٹ کر نہیں آتے''۔

''ہاں بیٹے مرنے والے تو چلے گئے لیکن یہ سب ضروری ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا انسان کا سب سے بڑا فرض ہے اور ہمسایہ کا حق تو سب سے بڑا حق ہے۔ خواجہ صاحب بھلے آدمی تھے، نیک ملنسار، ہمدرد اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے ہمسایہ تھے، اُن کے لواحقین کا دکھ ہمارا بھی دکھ ہے۔ یہی مروّت ہے، یہی ہمدردی ہے، مان مریادا ہے۔ تین دن تک ویڈیو، ٹی وی بند رکھنے سے خواجہ صاحب واپس تو نہیں آسکتے لیکن اُن کے غمزدہ پسماندگان کو ہلکی سی تسکین ملے گی کہ ان کے غم میں کوئی شریک ہے ان کا غم ان ہی کا نہیں ان کے ہمسایوں کا بھی ہے۔ سارے محلے کا ہے ساری برادری کا بھی ہے۔ اس طرح ان کا غم بٹ جائیگا۔

غم بٹ جاتا ہے تو ہلکا ہو جاتا ہے"۔

سعادت مند بچوں نے باپ کے حکم کے سامنے سر جھکایا۔ بھائی جان کے ساتھ ساتھ بنٹی نے بھی وضو کیا۔ جنازہ میں شرکت کی۔ تجہیز و تکفین کی ادائیگی مکمل ہوئی تو پاپا نے خواجہ صاحب کے بڑے بیٹے کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا......

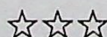
"بیٹے ...... ہمت سے کام لو۔ اب تمہیں خواجہ صاحب کی جگہ لینی ہے ......ہم تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں"۔

کلثوم نسرین کو دلاسہ دے رہی تھی۔ امی نے خواجہ صاحب کی بیوہ کو سنبھال رکھا تھا......سارے ہمسایے جمع تھے، خواجہ صاحب کے بڑے بیٹے کے سسرال والوں نے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ نسرین کے ماموں، جو حال ہی میں امریکہ سے لوٹے تھے اپنے دو چھوٹے بھانجوں کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد خواجہ صاحب کی باتیں ہونے لگیں۔ مرنے والے کی صفات بیان ہونے لگیں تو نسرین کی امی کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ نسرین بھی رونے لگی۔ تب اُس کے ماموں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"آصف"۔

"آصف اُن کے ملازم کا نام تھا" وہ پلک جھپکنے میں سامنے آیا۔

"ایسا کرو آصف ......جلدی سے گاڑی لے کر گھر جاؤ، میں جو اپنے ساتھ نئے ویڈیو کیسٹ لے آیا ہوں، انہیں لے کر آؤ۔ بچوں کا دل بہل جائے گا"۔



گونگے گلاب

گُل دو دن سے غائب تھا اِسی لئے ساجد بے حد اُداس تھا۔ اُس کی اُداسی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ آج صُبح سے ہی اُس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹتا چلا آ رہا تھا......!

ساجد اچھی طرح جانتا تھا کہ جس روز اُس کا باپ گھر دیر سے لوٹتا تو اُس کی ماں کو ضرور پیٹتا......اور یہ سب کچھ وہ تب سے دیکھتا چلا آ رہا تھا جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنی آٹھ سالہ زندگی میں ساجد نے اپنے غصیلے باپ کو ایک مرتبہ بھی مُسکراتے ہوئے یا ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہر وقت کرختگی چھائی رہتی عام حالات میں بولتا بھی وہ بہت کم تھا۔ باپ کی آواز سنتے ہی اُس کا ننھا سا دل دھک سے رہ جاتا۔ اپنی ٹانگوں سے جان سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اور وہ فوراً اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر ماں کے پیچھے چُھپ جاتا۔ جب تک باپ گھر میں موجود رہتا وہ ایسا محسوس کرتا جیسے لال پگڑی والے گھر میں موجود ہوں۔ چپ چاپ دم سادھے کسی کونے میں دُبکا پڑا رہتا یا اپنی ماں کے پیچھے اس طرح چھپنے کی کوشش کرتا کہ اُس پر باپ کی نظر نہ پڑ سکے۔ ماں خاموشی سے باپ کے سامنے کھانا رکھ دیتی یا سماوار میں سے چائے انڈیلتی تو وہ نظریں نیچی کئے ہوئے فرش کو تکتا رہتا......اُس کا

باپ اکثر کھانے کے موقعے پر ہی چیخنے لگتا۔ چیختے چیختے اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگتیں۔ مُنہ کے کونوں سے جھاگ بہنے لگتی۔ بعض اوقات کھانے کی تھالی یا کوئی دوسرا برتن اپنی پوری قوّت سے چولھے کی طرف کھینچ مارتا...... اور پھر اُس کی ماں کو پیٹنا شروع کر دیتا۔ اس کی ماں خاموشی سے لاتیں اور گالیاں سہتی رہتی۔ اُس نے آج تک اپنی ماں کو کبھی چیختے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جب اُس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹ کر گھر سے باہر جاتا تو وہ ساجد کو سینے کے ساتھ لگا کر بہت روتی۔ ساجد کی نیلی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے اور پھر اپنی ماں کی گود میں سر چھپا کر سو جاتا......!

جس روز اُس کا باپ زیادہ غصّے میں ہوتا اور ہمسایوں کی مداخلت کے باوجود چیختا رہتا تو اُس روز ساجد کی حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی وہ فوراً گھر سے باہر آجاتا، تارکول کی لمبی سیاہ سڑک پر دوڑنا شروع کر دیتا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے...... اُس کا دم پُھولنے لگتا لیکن وہ دوڑتا ہی چلا جاتا۔ بستی پیچھے رہ جاتی، سڑک چھوڑ کر وہ بادام کے باغوں میں سے گذرتا ہوا پہاڑی کے دامن میں بھی دوڑتا رہتا اور پھر راستے کے اختتام پر نشیب میں جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں کے پیچھے ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر ہانپنے لگتا۔ آہستہ آہستہ اُس کی سانسیں اعتدال پر آجاتیں لیکن آنسو اُسی رفتار سے بہتے رہتے...... پھر وہ ناشپاتی کے پیڑ سے ٹیک لگاتا۔ اِسی حالت میں اُس کی آنکھ لگ جاتی۔

آنکھ کھل جانے پر وہ اپنے آپ کو بے حد اُداس پاتا اور اُداس نظروں سے

جنگلی گلابوں کو دیکھتا رہتا...... دیودار اور چیڑ کے جنگل سے آنے والے ہوا کے لطیف جھونکے اُس کے لمبے ریشمی بالوں کو اُلجھاتے۔ نالے کا پانی بہتا رہتا۔ گلاب مُسکراتے رہتے۔ ہرے رنگ والے طوطے، کچی ناشپاتیوں کو کتر کتر کر ڈالتے، سنہرے پروں والی تتلیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتیں۔ چیونٹیوں کی لمبی قطار بادام کے باغوں سے ہو کر گزرتی۔ گُل ہزار مرتبہ چیخ کر اپنا چوڑا چکلا سینہ ٹھونک کر اُس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اُس کی آنکھیں جھپکنے کا نام تک نہ لیتی تھیں۔ گل کو ایسا لگتا جیسے ساجد بولنے کے ساتھ ساتھ سننے کی طاقت بھی کھو بیٹھا ہو، تب گل ناشپاتی کے پیڑ سے اُتر کر کپڑے پہنتا اور جنگل کی طرف قدم بڑھاتا۔ لیکن ساجد خاموشی کے ساتھ گلابوں کو دیکھتا رہتا۔ جو ہمیشہ اُس کی طرح خاموش رہا کرتے تھے۔ جو مُسکراتے تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے۔ پھر جب سورج بادام کے باغوں کے پیچھے اپنا سُرخ جال پھیلاتے ہوئے دُور مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپنے چلا جاتا تو وہ سر جھکاتے ہوئے بستی کی طرف اپنے قدم بڑھانا شروع کر دیتا۔

جنگلی گلاب، نالے کا نیلا پانی اُس میں چُھپے ہوئے سفید گول گول پتھر اور نالے کے کنارے اُگے ہوئے جعفری، شور مچاتے ہوئے طوطے۔ چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاریں، ناشپاتی کا پیڑ سنہری اودی اور طاوسی رنگ کی تتلیوں کے علاوہ گل بھی اُس کے دوستوں میں شامل تھا۔ گل جس کے بال بے حد لمبے تھے اور چمکیلے تھے۔ جس کا سینہ بے حد چوڑا تھا اور جو ہر وقت مُسکراتا رہتا تھا۔ لکڑی کے کارخانے میں ملازم تھا۔ شام کو جب کارخانے میں چھٹی ہو

جاتی تو وہ گرد سے اٹا ہوا نالے پر نہانے کے لئے آجاتا۔ شروع میں وہ اس لمبے بالوں والے لڑکے سے لاتعلق سا رہا تھا۔ جو کبھی ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر بے حد اُداس نظروں سے جنگلی گلابوں کو دیکھتا رہتا یا کبھی چیونٹیوں کی لمبی قطاروں کے ساتھ رینگتا ہوا نظر آتا۔ لیکن ایک روز جب وہ نالے سے نہا کے نکل رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ وہ لڑکا ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر رو رہا ہے۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے لڑکا چیخنا چاہتا ہو لیکن چیخ نہ سکتا ہو۔ کچھ دیر تک خاموشی سے اُس کو دیکھتا رہا پھر اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکا چونک سا پڑا اُس نے لڑکے سے رونے کی وجہ پُوچھی لیکن لڑکا روتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کو پتہ چلا کہ لڑکا گونگا ہے۔ وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کے دل میں لڑکے کے لئے ایک عجیب سی ہمدردی کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ اُس نے لڑکے کو چُپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی اُس کو چمکارا۔ سنہری رنگ کی تتلیاں پکڑ کر لائیں۔ کچے بادام توڑ کر لایا۔ سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ لیکن لڑکے کا رونا بند نہ ہوا تب گُل نے اپنے دونوں ہاتھ مُنہ سے لگائے اور چیخنے لگا۔

''میں ٹارزن ہوں...... میں گدھا ہوں...... تُم میرے باپ ہو...... لیکن اے میرے خوبصورت پُھول میں تُم کو ہنسا کر ہی دم لوں گا......!''

پھر وہ ناشپاتی کے پیڑ کی ایک اُونچی ڈال پر لٹک گیا اور جھولنے لگا۔ ڈال اُس کا وزن برداشت نہ کر سکی، چُرمُرا کر ٹوٹ گئی اور گل سمیت نالے میں گر گئی۔ عین اُس لمحے ساجد نے رونا بند کر دیا اور نالے کی طرف بڑھا۔ گُل اس طرح کراہتے ہوئے پانی سے باہر آگیا جیسے اُس کو زبردست چوٹ آئی ہو۔

لڑکے کی پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اُسکے قریب پہنچ کر گُل دوزانوں جھک گیا۔ نیلی آنکھوں میں پریشانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اپنا گورا گول مٹول ہاتھ گل کے کندھے پر رکھ کر اُسکے قریب آ گیا۔ گُل نے اُس کو اپنے سینے کے ساتھ لپٹا لیا۔ لڑکے نے ایک ڈھیلی سانس چھوڑ دی کچھ دیر بعد وہ آرام سے گل کی گود میں سو رہا تھا۔ اور گل کی آنکھیں دُور مغربی اُفق پر جمی ہوئی تھیں۔

دوسرے روز گل نے لڑکے کو راہ دیکھتے ہوئے پایا۔

پھر ایک روز لڑکا اپنی ماں کو بھی ساتھ لے آیا۔ وہ شاید اپنی ماں کو اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا تھا کیونکہ جب وہ جنگل میں کوئی نئی چیز یا کسی نئے دوست کو دریافت کرتا تو اپنی ماں کو ضرور دکھانے لے آتا۔ گُل کو دیکھتے ہی اُس کی ماں گھبرا سی گئی لیکن جلد ہی اُس کو معلوم ہو گیا کہ ساجد کے اور دوستوں کی طرح گُل بھی اُس کا بے ضرر قسم کا دوست ہے۔

دُکھ میں کوئی انسان معمولی سی ہمدردی کا اظہار کرے تو دُکھی انسان اپنے دل کے سارے دروازے کھول کر دُکھوں کے آنسو بہانے لگتا ہے۔

گُل خاموشی سے ساجد اور اُس کی ماں کی کہانی سُن رہا تھا۔ ساجد کی ماں سے ہی اُس کو معلوم ہو گیا کہ ساجد پیدائشی گونگا نہیں بلکہ تین برس کی عمر میں جب کہ وہ ایک ننھے مُنے بھائی کا بڑا بھائی بن گیا تھا۔ تو باپ کا غصّہ قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک زور کی لات چلی۔ ساجد کا تین روز کا بھائی اُس سے جدا ہو گیا۔ ساجد جو صرف تین سال کا تھا ایک دم خاموش ہو گیا...... ایسا خاموش کہ اب تک......!

ساجدؔ کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

آج بھی جب اُس کے باپ نے اُس کی ماں کو پیٹنا شروع کیا تو وہ سہم کر ایک کونے میں دبک گیا۔ غفار کاکا بھی آ گیا۔ زونی موسی بھی آ گئی۔ اور بہت سارے لوگ آ گئے لیکن اُس کا باپ چیختا ہی رہا۔ وہ دبے پاؤں باہر آ گیا، اور باہر آتے ہی تارکول کی سیاہ لمبی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اب وہ ناشپاتی کے پیڑ کے تنے سے لگ کر خاموشی سے جنگلی گلابوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب تک کئی بار اُس چھوٹے سے راستے کی طرف اپنی نظریں اُٹھا چکا تھا جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔ لیکن گُل کا دُور تک نشان نہ تھا۔

ایک لمبی سانس لیکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور نالے کی طرف بڑھا۔ رات کو بارش ہوئی نالے کا نیلا پانی گدلا ہو گیا تھا۔ چلو سے پانی پکڑ کر وہ نالے میں واپس ڈالنے لگا۔ نالے کے کنارے بیٹھ کر وہ اکثر اسی طرح وقت گذاری کرتا تھا۔ اب کی بار جو اُس نے اپنے ہاتھ پانی میں ڈال دیا تو وہ کسی نرم لچکیلی چیز سے ٹکرائے۔ اس نالے میں چھوٹی مچھلیوں کی بہتات تھی۔ اس خیال سے کہ کوئی بڑی مچھلی رہی ہو۔ ساجدؔ نے اُس نرم لچکیلی چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پانی سے باہر لے آیا۔

نیلی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ہونٹ لرزنے لگے......!

اُس کے ہاتھوں میں ایک نوزائیدہ بچے کی لاش تھی......! لاش نیلی پڑ گئی تھی اور پھول گئی تھی۔ سر کے بال چپک کر رہ گئے تھے......! جب اُسکا باپ

اُس کی ماں کو پیٹتا تو اُس وقت اُس کے دل میں ایک طوفان سا اُٹھتا۔ اُس سے بہت تیز طوفان اس وقت اُس کے دل میں اُٹھا۔ چیخنے کی ناتمام کوشش سے اُس کا بدن لرزنے لگا۔

وہ شاید بچے کی لاش سے پُوچھنا چاہتا تھا...... بھیّا تو کون ہے......؟ تو اس نالے میں کیوں پڑا ہوا تھا......؟ تمہاری ماں کون ہے......؟ تم کس کے بھیّا ہو......؟ کیا تمہارے ابو نے بھی تمہاری ماں کو پیٹا تھا؟ کیا تُم بھی اپنے ابو کی لات سے مر گئے ہو......؟ وہ ہزاروں سوال نوزائیدہ بچے کی لاش سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن بچے کی لاش خاموش تھی۔ اور خود اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہ تھا......!

جب وہ چیخ بھی نہ سکا اور اپنے سوالوں کا جواب بھی نہ پا سکا۔ تو اُس نے لاش وہیں کنارے پر ڈال دی، اور پھر گلاب کی جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس کو پھلانگتا ہوا بادام کے باغوں کی طرف دوڑ پڑا۔

گھر میں ایک منحوس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ باپ گھر میں نہ تھا۔ ماں چولھے سے اُٹھتے ہوئے سُرخ شعلوں پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہی تھی۔ اُس نے ماں کو آواز دینا چاہی لیکن ہمیشہ کی طرح ناکام رہا۔ پھر دوڑ کر اپنے بازو ماں کے گلے میں ڈال دئے۔ ماں نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اُس سے کئی سوالات کئے لیکن ساجد اشاروں اور کنایوں کے باوجود اُس کو اپنا مطلب نہ سمجھا سکا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی سمجھ سکی کہ ساجد کو اپنا تین روز کا بھائی یاد آ گیا ہے۔ کیونکہ اکثر وہ ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔

جب وہ بھی اپنا مطلب سمجھانے میں ناکام ہوا تو اُس نے ماں کا دامن پکڑ لیا اور باہر کی طرف لے جانے لگا۔ ماں سمجھ گئی کہ وہ اُس کو جنگل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن آج اُس نے جانے سے اِنکار کر دیا کیونکہ آج دن میں جتنی بھی گالیاں اور جتنی بھی لاتیں اُس کو سہنا پڑی تھیں، اُن سب کی ذمہ داری ساجد کے دوست ٹارزن پر عاید ہوتی تھی......!

وہ ساجد کو زبردستی واپس اندر لے آئی۔ اور اُس کو کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ ساجد بہت دیر تک دروازے پر زور آزمائی کرتا رہا ماں اپنے دل کے دروازے کے ساتھ ساتھ اپنے کانوں کی کھڑکیاں بھی بند کر چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کافی اُونچی تھی۔ اُس تک پہنچنے کی کوشش میں ساجد اس قدر تھک گیا کہ بے سدھ ہو کر ایک طرف گر گیا۔

دوسری صبح جب سورج مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے ہی چُھپا ہوا تھا۔ ساجد بادام کے باغوں میں بھاگتا چلا جا رہا تھا......! گلاب کی جھاڑیوں کے قریب پہنچکر وہ رُک گیا۔ اگر وہ چیخ سکتا تو اُس کی چیخ آسمان تک پہنچ جاتی۔

نوزائید بچے کی لاش پر ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا کتا جُھکا ہوا تھا۔ ساجد کے چہرے پر غصّے اور بے بسی کی مِلی جلی لکیریں اُبھر آئیں اُس نے قریب پڑے ہوئے ایک نوکیلے پتھر کو اُٹھایا۔ اور اپنی پُوری قوت سے کتے پر کھینچ مارا۔

پتھر کُتے کے سر پر لگ گیا۔ اور ایک خطرناک غراہٹ کے ساتھ دُور ہٹ گیا۔ کتے کے ہٹتے ہی ساجد نے ناشپاتی کے پیڑ کی طرف چھلانگ لگا دی وہ اپنے آپکو سنبھال نہ سکا۔ مُنہ کے بل گرا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو نوزائیدہ بچے کی

لاش اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اُس کا ایک بازو اور چہرے کا آدھا حصّہ غائب تھا۔

ساجد نے ایک مرتبہ پھر چیخنا چاہا لیکن اب کی بار بھی وہ ناکام رہا۔ کتے کی آنکھوں میں ساجد کے لئے نفرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایک اور پتھر اُٹھا کر اُس نے پُوری قوت سے کتے کی طرف کھینچ مارا۔ کتے نے اُچھل کر اپنے آپ کو صاف بچالیا۔ اس کے بعد ساجد جیسے پاگل ہی ہوگیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں پتھر اُٹھا کر وہ نالے میں کُود پڑا۔ کتا جنگل کی طرف بھاگا۔ ساجد دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا۔ ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اُس کو گرتا دیکھ کر کتا رُک گیا اور پھر فوراً ناشپاتی کے پیڑ کی سیدھ باندھی۔ ساجد کپڑے جھاڑنا بُھول گیا اور اپنی پُوری رفتار سے کتے کے پیچھے لپکا۔ لیکن نئے منظر نے اُس کو اور بھی دیوانہ کر دیا۔ تین کوّے نوزائید بچے کی لاش پر ٹھونگیں مار رہے تھے۔ اور دوسری طرف ایک مریل کتا لاش کی ٹانگ کو چبا رہا تھا۔ ساجد نے ایک مرتبہ پھر چیخنا چاہا لیکن اب کی بار بھی پتھروں سے کام چلانا پڑا۔ کوّے اُڑ گئے لیکن اُوپر ناشپاتی کے پیڑ پر ہی منڈلاتے رہے۔ مریل کتا ٹانگ چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ اور خود ساجد بے سدھ ہو کر اس طرح نوزائید بچے کی لاش پر گر گیا کہ ساری لاش اُس سے ڈھک گئی......! پھپھوندی ہوئی لاش اُس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ وہ خود بے تحاشا ہانپ رہا تھا۔ گلا خشک اور زبان کانٹا بنکر چُبھ رہی تھی۔

کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے اُس کے اُوپر سے گزرنے لگے۔

دونوں کُتے قریب آنے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ موٹا تارہ کُتا زیادہ دلیر ثابت ہوا ساجدؔ کی پرواہ کیئے بغیر اُس نے اپنی تھوتھنی ساجدؔ کی ٹانگوں میں گھسیڑ دی جہاں سے لاش کا ایک حصہ جھانک رہا تھا۔ سرسراہٹ محسوس ہوتے ہی ساجدؔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کُتے کو اپنے قریب دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوف کی لہر دوڑ گئی، ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر اُس نے سیدھا کُتے کے ماتھے پر کھینچ مارا۔ کُتے کے ماتھے سے خون کا فوراہ پُھوٹ پڑا۔ خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ خونخوار انداز میں غرّ ایا۔ اور ساجدؔ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی ریڑھ کی ہڈی پر برف کی سل رکھ دی گئی ہو۔ ابھی وہ اس خطرے سے نمٹنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسری طرف سے مریل کُتا آگے بڑھا اور لاش کو اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ اور اس سے پہلے کہ ساجدؔ مریل کُتے کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ سیاہ رنگ کا کُتا مریل کُتے پر جھپٹا اور اُس کو بھبھونڈنے لگا۔ کُتوں کو آپس میں لڑتا دیکھ کو تینوں کوّے جو اُوپر منڈلا رہے تھے۔ خونخوار بازوں کی طرح شکار پر جھپٹ پڑے۔ ساجدؔ پتھر لے کر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ کوّے فوراً اُڑ گئے۔ اتنی ہی دیر میں سیاہ کُتا اپنے دُشمن کو بھگا چکا تھا۔ ساجدؔ کو کوؤں پر پتھر برساتے دیکھ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ساجد نے پاگلوں کی طرح اُس کی طرف چھلانگ لگا دی۔ کُتا پھرتی کے ساتھ ہٹ گیا۔ لیکن لاش اُس کے مُنہ میں دبی رہی۔ اور اسی حالت میں اُس نے جنگل کا رُخ کیا۔ نہ جانے کب تک ساجد اُس کے پیچھے دوڑتا رہا۔ نہ جانے وہ کب تک روتا رہا، اُس کا سارا جسم گرد و غبار سے اٹ گیا۔ وہ اب بھی کُتے کے پیچھے پتھر لے کر بھاگ رہا تھا۔ لیکن اب اُس کو ایسا

محسوس ہو رہا تھا جیسے سینکڑوں کُتے اُس کی ٹانگوں کو کھینچ رہے ہوں۔ اور ہزاروں کوّے اُس کی پیٹھ پر ٹھونکے مار رہے ہوں۔

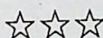
آنکھوں کے سامنے چھا رہے اندھیرے میں اُس نے گل کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ گُل کی بانہوں میں آتے ہی وہ چیخ پڑا۔

''ساجد!'' گل کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

ساجد کی آواز بے حد دھیمی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

''بھیا...... بھیا...... کُتا لے گیا۔ کُتا...... لے گیا____''

گُل پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اُس پر کسی کا سایہ پڑا۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا...... وہ ساجد کی ماں تھی...... تھوڑی دیر بعد گُل، ساجد کو گود میں اُٹھائے ہوئے جنگل کی طرف جا رہا تھا...... ساجد کی ماں پیچھے پیچھے آرہی تھی۔



درد کا مارا

میں صبح سے کسی مایوس، غمزدہ اور پریشان حال بے روزگار نوجوان کی طرح شہر کی خاک چھان رہا ہوں۔ بے مقصد، بے مدعا ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک گلی سے دوسری گلی جب دل کی وادی میں اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہو تو چلتے رہنا بھی کسی کام نہیں آتا۔ کوئی کہاں تک چلتا رہے دل کی ویران بستی میں اُمید کی کوئی رمق نہ ہو۔ نظر میں کوئی کنارہ نہ ہو۔ فضا اپنے بس میں نہ ہو...... تھک جاتا ہوں تو کسی پارک میں کسی بینچ پر بیٹھ جاتا ہوں اور سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔ سگریٹ نوشی میری عادت نہیں نہ میرے اضطراب کو سگریٹ کا کسیلا دھواں کسی قسم کی تسکین دیتا ہے۔ ہر لمبے کش کے بعد میں اپنے آپ کو خالی خالی محسوس کرتا ہوں۔

میں کوئی بے روزگار نوجوان نہیں۔ ایک ریٹائر شدہ سرکاری ملازم ہوں، جس نے اپنی زندگی ایک شریف ذمہ دار، خوددار، اپنی بیوی بچوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے شخص کی طرح گذاری ہے۔ نہ کوئی بُری عادت، نہ لَت، نہ چسکا۔ بس گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر...... ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نوٹوں کی گڈری اپنی بیوی کے دامن میں ڈالتا۔ بچوں کو آہستہ آہستہ بڑھتے دیکھنا ان کی ہر جائز ضرورت اور فرمائش کو پوری کرنا، ان کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا

خیال رکھنا، خوش قسمتی سے بچے بھی قابل اور ہونہار...... نہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہ اُلجھن۔ دونوں نے اطمینان بخش طریقے سے تعلیم حاصل کی۔ محنتی اور فرمانبردار، نہ کوئی بُری عادت نہ بے راہ روی کے شکار۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام آرام سے ہوگیا۔ بڑا لڑکا کمپیوٹر انجینئر اور اُس سے چھوٹے نے بجلی میں ڈگری حاصل کی۔ اپنے شہر میں نوکری نہ ملی تو مایوسی کے شکار نہ ہوئے۔ سال ڈیڑھ سال بعد بڑے لڑکے کو گلف میں اچھی کمپنی میں نوکری ملی چھ ماہ کے اندر اندر اس نے چھوٹے بھائی کے ویزا اور نوکری کا بھی انتظام کیا۔ لڑکی سب سے چھوٹی تھی۔ اس نے آرٹس میں گریجویشن کی۔ ٹیچرز ڈگری حاصل کی اور دو چار مہینوں کے انتظار کے بعد ایک اچھے سکول میں اسے بھی ملازمت ملی۔

بچوں کی شادی کا مسئلہ درپیش آیا تو لڑکوں نے سارا انتظام خود دیکھا۔ پہلے اپنی بہن کی شادی ایک اچھے، شریف خاندان کے خوبصورت اور باروزگار نوجوان سے کردی۔ سال ڈیڑھ سال بعد اچھے گھرانوں کی دو سگھڑ اور وفا شعار لڑکیوں کو پسند کیا۔ اسطرح ہم دونوں میاں بیوی اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔ گھر میں موبائل، فون، فرج اور ہم دونوں کے استعمال کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی سب کچھ آگیا۔ لڑکے سال بھر میں چالیس پچاس دن کی چھٹی پر آجاتے۔ روپے پیسے کی تنگی کبھی نہ ہوئی اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد ہم زیادہ آسودہ حال ہوگئے۔ بیوی کی زبان سے تشکر کے کلمات کے سوا اور کچھ نہ نکلتا۔ دونوں لڑکے صاحب اولاد ہوگئے اور ہم میاں بیوی دادا اور دادی کے پُرمسرت احساس سے بھی سرفراز ہوگئے۔

لڑکی بڑے آرام سے تھی۔ ساس سُسر جان چھڑکتے تھے۔ نند اور دیور کی طرف سے بہن بھائیوں کا پیار ملا۔ شوہر کسی بھلے مانس کی طرح اپنی بیوی، اپنے بہن بھائیوں اور اپنے بوڑھے ماں باپ کا خیال رکھتا تھا۔ زندگی ایک ایسی کشتی کی مانند وقت کے دریا میں بہہ رہی تھی جس میں نہ کوئی طوفان تھا نہ سیلاب کا ڈر، نہ بھنور نہ ٹوٹے کنارے......لڑکی کی شادی کو چھ سال گزرے اولاد کی نعمت سے اب تک بے بہرہ تھی۔ سُسرال والوں نے اچھے اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سادھو سنتو، پیر فقیر، ہر آستانے پر حاضری دی۔ حضرت بابا پیام الدین کے آستانے پر متعدد بار حاضری دی اور وہاں چولہے کی لیپ پوت کی۔ کہیں کوئی نقص نہ تھا۔ دونوں میاں بیوی نارمل تھے۔ پھر، اولاد کیوں نہ ہوتی تھی۔ خدا کی مرضی ......لڑکے گھر آئے تھے تو بہن کی سونی گود دیکھ کر اپنے ساتھ لائے قیمتی تحفے اٹیچیوں میں ہی بند رہے اب دونوں گھرانوں میں ایک ہی موضوع زیرِ بحث تھا۔ اولاد، آنگن کی مُسکان، زندگی کا دلکش نغمہ، خوابوں کی دلنشین مہک، لیکن اندھیرے بڑھتے جا رہے تھے۔

پھر ایک دن لڑکی نے بتایا، انہوں نے نیند لانے والی ادویات کا باضابطہ استعمال شروع کیا ہے۔ شام کو گولی نہیں لیتے تو ساری رات کروٹیں بدلتے ہیں۔

چھیاسٹھ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ کسی اَن دیکھے طوفان، کسی نادیدہ بھونچال سے لائی ہوتی تباہی اور بربادی کی پرچھائیاں دل کے نہاں خانوں پر لرزنے لگیں۔ جیسے کوئی دلنشین خواب بیچ میں ٹوٹ گیا ہو۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کس جہاں میں کھو جاتا ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سماعت بھی کھو چکا

ہوں۔ گویائی بھی اور بصارت سے بھی محروم ہو گیا ہوں۔ زیادہ سوچنے سے ارادے کمزور پڑ جاتے ہیں لیکن نجانے کب اور کیسے ہونٹوں پر ایک تھر تھراہٹ سی پیدا ہوئی۔

میری غیر موجودگی میں میرے کسی خیر خواہ نے گھر فون کیا۔ ''تمہارے داماد نے تمہاری بیٹی کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا ہے اور نئی شادی کر رہا ہے''۔

ساری رات ہم دونوں میاں بیوی سو نہ سکے۔ کروٹ پر کروٹ بدلتے رہے میں نے سگریٹ کا ناکام سہارا لیا۔

دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔

تیسری رات بھی ایسا ہی ہوا، پھر روز کا معمول بن گیا۔

لڑکی کسی نہ کسی طرح اپنے گھر سے چمٹی رہی، چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ مائیکے آتی تو چپ چاپ ماں سے مِل جُل کر روتی رہتی۔ جس ان دیکھے طوفان نے اتنے دنوں سے ڈرا رکھا تھا اُس نے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں ہلا کے رکھ دی تھیں۔

پھر طلاق کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

آج طلاق کا دن ہے۔ میں صبح سویرے گھر سے باہر آ گیا ہوں اور کسی غمزدہ، مایوس اور پریشان حال بے روزگار نوجوان کی طرح شہر کی سڑکیں ناپ رہا ہوں۔ لڑکے طلاق رکوانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ میں صبح سے دو پیکٹ سگریٹ پھونک چکا ہوں۔ میونسپل پارک کے ایک بینچ پر بھوکا پیاسا بیٹھا ہوں۔ پارک میں بہت کم لوگ ہیں۔ ایک نوجوان جوڑا میرے نزدیک

بیٹھا اپنے مستقبل کے سنہرے خواب سجانے میں مصروف ہے۔

ایک پندرہ سالہ برس کی لڑکی پھٹا پُرانا برقعہ اُوڑھے میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ برقعے کی نقاب اُلٹی ہوئی ہے۔ سفید دانتوں کی قطاریں یوں نظر آتی ہیں جیسے کچی مکئی کے دانے قرینے سے جُڑے ہوں۔ اس کی گود میں چھ سات ماہ کا ایک بچہ ہے۔ گورا چٹا، گول مٹول، لمبے سیاہ بال۔

وہ میرے قریب آ جاتی ہے۔

"بابو جی، صبح سے کچھ کھایا نہیں"۔ بچہ بہت پیارا ہے۔ میں نہ جانے کن خیالوں میں کھو جاتا ہوں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگتے ہیں۔

"بابو جی...... صبح سے بچہ بلک رہا ہے"۔ دائیں ہاتھ میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں پرس کھولتا ہوں۔ دس بیس، پچاس، ایک سو، پانچ سو...... پانچ سو کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آتی ہے۔ وہ پانچ سو کا نوٹ گریباں میں ڈال دیتی ہے۔

بابو جی...... گھر میں بیوی نہیں۔ وہ مسکرا پڑتی ہے۔

میں اُس ادھ جلے مکان میں انتظار کر رہی ہوں۔ میرے جانے کے پانچ منٹ بعد آ جانا"۔



بادشاہ

کہانی سُنا کر جب میں نے سر اُٹھایا تو میں نے دیکھا کہ بادشاہ سو چکا ہے، لیکن مور پنکھ جھلنے والے وہ دونوں دیوہیکل سیاہ فام غلام اب بھی بادشاہ کے سراہنے اپنا کام کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ خود کار کرگھوں کے طرح اُٹھ رہے تھے۔ جیسے اُن کی زندگی کا بس یہی ایک مقصد رہ گیا ہو، جیسے وہ اپنی پیدائش سے اب تک اس طرح بادشاہوں کو پنکھے جھلتے چلے آرہے ہوں۔ جیسے اُن کے دل کے نہاں خانوں میں کوئی خوشی نہ ہو۔ کوئی غم نہ ہو، کوئی اُمید نہ ہو۔ اُن کے سیاہ چمکتے ہوئے جسم دیکھ کر آج بھی نہ جانے کیوں میرا جی چاہا کہ میں اُٹھ کر بادشاہ کے سر پر ایک چپت رسید کر کے جگا دوں۔ اور اُسے ان دو غلاموں کی کہانی سناؤں۔ ایک بے رس خشک کہانی جس میں نہ کسی جاگیردار کے حرم کی رنگینیاں تھیں اور نہ کسی عیش پرست رئیس کی حویلی میں پلنے والے حُسن کی شگفتگی، لیکن میں نے اپنے آپ سے کہا...... بے وقوف آدمی تم شاہی داستان گو ہو، تمہارا کام بادشاہ سلامت کو ایسی کہانیاں سُنانا ہے۔ جن میں عورتوں کے حُسن کا ذکر ہو، تمہارا زور صرف عورتوں کے سحر انگیز حسن کو بیان کرنے پر صرف ہونا چاہیئے، نہ کہ ان سیاہ فام غلاموں کے ان دیکھے آنسوؤں پر، بادشاہ سلامت کو ان کالے بدبختوں کی کہانی میں کسی قسم کی دلچسپی نظر نہیں آئے گی۔ تم بادشاہ کی رگ رگ سے واقف ہو۔ اُس چمک کو بھول نہ جاؤ جو

بادشاہ سلامت کی چھوٹی چھوٹی حریص نگاہوں میں اُس وقت عود کرتی ہے۔ جب تم کسی حسین دوشیزہ کی رنگین داستان اپنے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہو، اُس چمک کے عوض تمہارا گھر سونے کی اشرفیوں سے بھرتا جارہا ہے۔ حُسن و عشق کی رنگین فرضی داستانیں جو تم دِن رات گھڑتے رہتے جو تمہاری روزی ہیں۔ روٹی ہیں۔ تمہیں ان ہی داستانوں سے شہرت مِلی ہوئی ہے اور ساری سلطنت میں تمہاری دھوم ہے، بڑے امراء اور رئیس تمہاری دوستی کا دم بھرتے ہیں، صرف اس لئے تم شاہی داستان گو ہو، اسی لئے ان سیاہ فام غلاموں کو ان کی بے رس کہانیاں کو بھول جاؤ اور گھر جا کر کل کے لئے کوئی رنگین داستان گڑھ لو، تاکہ کل بھی بادشاہ سلامت تمہیں انعام و اِکرام سے نوازے!!

میں نے حبشیوں کی طرف ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال دی اور پھر دبے پاؤں بادشاہ کی خوابگاہ سے باہر نکل آیا۔ محل میں ایک بڑی پیاری سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی حسینہ گہری سوچ میں ڈوبی ہو، فانوس مدھم تھے، بارہ دریوں میں ہوائیں سرسرا رہی تھی، جیسے محل سرا کی حسیناؤں کے پردے آنچل لہرا رہے ہوں۔ ہلکی ہلکی روشنیوں میں ترنم ریز سرگوشیاں اُبھر رہی تھیں۔

محل سے باہر آکر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سینہ یکا یک خالی ہو گیا ہو، پچھلے برس سے یعنی جب سے میں نے اکتیسویں سال میں قدم رکھا تھا، میں جب بھی اس گندی تنگ اور تعفن آمیز گلی سے گذرتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا، جیسے میرا سینہ خالی ہو چکا ہو، جیسے سینے کے تمام سوتے سوکھ چکے ہوں۔

پہلے ایسا نہ ہوتا تھا، پہلے میں اس گلی سے کسی عام انسان کی طرح گذرتا تھا۔
مجھے اس گلی کی کسی بھی چیز میں دلچسپی نظر نہیں آتی تھی، اس گلی کی غلاظت،
بھوک بیماری، غریبی مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتی تھی۔ اس گلی میں شہر کی بے شمار
گلیوں کی طرح عام لوگ رہتے تھے اور اس طرح رہتے تھے، جس طرح دُنیا
بھر کے عام لوگ رہتے تھے، لہٰذا میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا اس گلی سے
گذرتا تھا، لیکن وہ دِن ...... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک رومان پرور اور
جذبات میں آگ لگا دینے والی فرضی داستان کے تانے بانے بنتا ہوا بادشاہ
کے محل کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، لیکن اس گلی میں داخل ہوتے ہی مجھے ایسا
محسوس ہوا جیسے میرا سینہ یکا یک خالی ہو گیا ہو۔

بادشاہ کے خونخوار مُلازم نہتے انسانوں کو گھسیٹتے ہوئے کہیں لے جا رہے
تھے، لگان، مالیہ، ٹیکس ایک کچرّے کے ڈھیر میں تین پلّے اور دو انسانی بچے
اپنی غذا تلاش کر رہے تھے۔

ایک مریل بوڑھا پچھاڑیں مار رہا تھا۔ وہ میری بیٹی کو لے گئے، میری
جواں بیٹی کو...... انصاف کہاں ہے؟ انصاف کہاں ہے؟

بادشاہ کے محل میں، لیکن بادشاہ کے محل میں جانے کی اجازت نہیں، اسلئے
چپکے سے آنسو بہاؤ، کیونکہ عام لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تو وہ صبر
کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ بادشاہ بے حد مصروف ہے، اُسے تمہارے آنسوؤں
کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں، اُسے دلچسپی ہے اپنے خزانے سے، حرم سے جو ہر
حالت میں دولت اور عورتوں سے بھرے رہنے چاہیں، بادشاہ کا خزانہ بھرا ہو

اور انسان کا پیٹ خالی ہو، تو حکومت کا کام آسانی سے چلتا ہے، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان کا پیٹ بھرا رہے، اور بادشاہ کا خزانہ خالی نہیں ہرگز نہیں، پھر بادشاہ، بادشاہ نہ رہے گا، بادشاہ بھرے ہوئے خزانے سے ہوتا ہے اور خزانہ تب بھرتا ہے جب انسان کا پیٹ خالی رہے، اس مُلک میں جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کی مرضی سے ہوتا ہے، تم سال بھر اپنے کھیتوں کی سینچائی، اپنی آرزوؤں سے کرو اور پھر بھی بھوکے رہو۔ یہ بادشاہ کی مرضی ہے، تم بادشاہ کے لئے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے محل بناؤ اور خود تنگ و تاریک کوٹھریوں میں گُھٹ گُھٹ کر دم توڑ دو یہ بھی بادشاہ کی مرضی ہے۔ تم بادشاہ کے لئے بہترین سے بہترین پوشاک بناؤ اور خود تمہارے جسم پر کھال کے سِوا اور کچھ نہ رہے، یہ بھی بادشاہ کی مرضی ہے، زمین خُدا کی ہے، لیکن مُلک بادشاہ کا ہے۔ اسی لئے لوگ بھی بادشاہ کے ہیں۔ لوگوں کی ہر چیز بادشاہ کی ہے، اُن کی عزّت، اُن کی آبرو، اُن کی آرزوئیں اور اُن کی تمنائیں، تمہارے پاس اگر کچھ ہے تو مسجدیں اور مندر ہیں، گرجے اور گردوارے ہیں۔ جن میں تم اپنے بنانے والے سے کوئی گِلا نہیں کر سکتے، کوئی شکایت نہیں کر سکتے، کیونکہ بادشاہ کے جاسوس گلی گلی میں بکھرے پڑے ہیں۔ اسی لئے خاموش رہو، اگر تم نے بادشاہ کیخلاف شکایت کی تو تم باغی کہلاؤ گے اور تمہیں شہر کے سب سے بڑے چوک میں پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا تا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

جس روز پہلی مرتبہ اپنا سینہ خالی خالی سا محسوس ہوا اُس روز بادشاہ کو میری کہانی میں کوئی خاص لُطف نہیں آیا۔ میں بار بار بہکا تھا، حالانکہ کہانی بڑی

سیدھی تھی۔ ایک ایسی جنس زدہ شہزادی کی جو ہر رات اپنے شبستان میں کسی نئے مرد کو لے کر جاتی اور صبح ہوتے ہی اُس کو قتل کروادیتی، تاکہ رات کی کہانی سحر ہونے سے پہلے ہی دم توڑ بیٹھے، لیکن کہانی سُناتے سُناتے میں بار بار بھوک، ظلم، غُربت، جہالت، بیماری اور بد نصیبی کی باتیں کرنے لگتا، وہ خیریت گُذری کہ بادشاہ کو بہت جلد نیند آگئی، ورنہ دوسروں کو عبرت دِلانے کے لئے مجھے یقیناً دوسری صبح شہر کے سب سے بڑے چوک میں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا، کافی سوچ وبچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مجھے باعزت طور زندگی گُذارنی ہے تو مجھے اپنی کہانیوں میں بھوک، ظلم غریب اور بیماری جیسے الفاظ ہرگز ہرگز استعمال نہ کرنے چاہیں۔ اور دوسرے دن سے میں بادشاہ کو معمول کے مطابق شہوت انگیز کہانیاں سُنانے لگا، لیکن میرا سینہ!!

وہ خالی ہوتا رہا، ہر شہوت انگیز، جذبات کو آگ لگانے والی کہانی سُنا کر مجھے ایسا محسوس ہوتا، جیسے اب سینے میں کچھ بھی نہ رہا۔ ایک پھانسی کے سِوا، اسی لئے بادشاہ سلامت مجھے انعام واکرام سے نوازتے، تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میرے ہاتھوں میں سونے کی اشرفیاں نہ ہوں، مٹی کے ڈھیلے ہوں، بے رنگ بے بو...... مجھے اپنا عالیشان مکان، آرائیش وزیبائیش کا ہر سامان اپنا وجود، سب کچھ کھوکھلا لگتا، اپنے سینے کی طرح، اپنی رُوح کی طرح۔!!

وہ صبح بڑی غمگین تھی، جس صبح شاہی داستان گو کو شہر کے سب سے بڑے چوک میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا، داستان گو کی سب سے بڑی بد نصیبی یہ تھی کہ وقت کے مؤرخ نے اُسے باغی قرار دیا تھا۔

میرا دوسرا جنم خدا ہی کی زمین پر ہوا، لیکن اب مُلک بادشاہ کا نہ تھا، لوگوں کا تھا، کیونکہ اب حکومت لوگوں کی تھی۔ لوگ ہی حاکم تھے اور لوگ ہی محکوم، لوگوں کی اسی حکومت میں، میں نے کہانیاں لکھنی شروع کیں، خیالوں کے طلسم کو جگاتے ہوئے، جہلم کے کنارے کنارے میں نے اپنا سفر شروع کیا۔

میری کہانیوں میں غنچوں کی دوشیزگی تھی، کُھلے گلابوں کی مہک تھی، جھرنوں کے نغمے تھے، میں اپنے افسانوں میں عورت کے حُسن میں قوس قزح کے سارے رنگ، شفق کی ساری لالی اور قُدرت کی تمام رعنائیوں کو سمو دیتا، عورت میرے افسانوں کا محور تھی، عورت جو خوبصورت ہے، جو زندگی ہے، جو چاہت ہے اپنے افسانوں میں، میں نے عورت کے ہونٹوں میں بادام کے تازہ کھلے ہوئے شگوفوں کی ملائمت بھر دی۔ اُس کی سانسوں میں تازہ مہکتے ہوئے گلابوں کی مہک بھر دی، اُس کی آنکھوں میں پہاڑی جھیلوں کے سُنہرے عکس سجائے اور اُس کے سینے میں ایک زندہ آتش فشاں پہاڑ رکھ دیا، جس میں جُھلسا دینے والی گرمی، مسحور کرنے والی تپش، بے خود کرنے والی گرماہٹ اور زندگی بخشنے والی حرارت تھی!

شہرت اور دولت میرے قدم چومنے لگی اور میں ملک کا سب سے بڑا اور مشہور افسانہ نگار بن گیا، پھر ایک دن میرا گذر اُس گلی سے ہوا اور دوسرے ہی لمحے مُجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سینہ یکا یک خالی ہو گیا ہو۔

میں نے اُس گلی میں ایک انتہائی خوبصورت عورت کو جس کے چہرے پر مریم کا تقدّس تھا۔ ایک روٹی کے عوض بِکتے دیکھا۔ روٹی اور عورت کے

چہرے کا رنگ ایک جیسا تھا، گندمی !!

میں نے ایک کچھرے کے ڈھیر پر دو انسانی بچوں اور تین پلوں کو اپنی غذا تلاش کرتے ہوئے دیکھا مجھے اُس گلی میں رہنے والے ہر شخص کے چہرے پر نامعلوم خوف کی پرچھائیاں دیکھیں، کسی اَن دیکھی آفت کی، کسی ایسی خوف ناک اور خون ریز جنگ کی جو ذہنوں میں لڑی جا رہی ہو۔

میں نے ہر شخص کی کمر جھکی ہوئی پائی، جیسے ہر شخص کی کمر پر اَن دیکھے مستقبل کا بوجھ لدھا ہو...... ایک خستہ حال نوجوان، جس کے چہرے اور سڑک کی دھول کا ایک ہی رنگ تھا، پچھلے دو سال سے بے کار ہوں۔ ایم اے ہوں ......نوکری چاہیئے"۔

ایک تنگ و تاریک کمرے میں چند بچے زور زور سے رٹے رٹائے جُملے دُہراتے تھے'

"علم بڑی دولت ہے"۔

میں اس گلی کی بدبُو، تاریکی، ظُلم، اور بیماری کو دیکھ کر گھبرا سا گیا، اور ایک اور گلی میں داخل ہوا، اس گلی میں بھی وہی سب کچھ تھا جو شہر کی ہر گلی میں تھا۔

میں اپنا خالی سینہ لے کر شہر سے باہر نکل آیا، مجھے اپنی شہرت، اپنی دولت، اپنا وجود خالی خالی سا نظر آنے لگا، اپنے سینے کی طرح اپنی خالی رُوح کی طرح ......سینے کی پھانس بڑھ سکتی'!

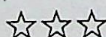
میں نے اپنی ساری گذشتہ تخلیقات وقت کے دریا میں بہا دیں اور نئے سرے سے لکھنا شروع کیا، زندگی کے جیتے جاگتے کرداروں کو لیکر میں نے

زندگی کی تلخ حقیقتیں لکھنا شروع کیں۔ میں نے کائنات کی ہر چیز، زندگی کے ہر شعبے میں اور وقت کے ہر گزرتے لمحے میں افسانے کا مواد پایا۔ میرا ادب، زماں و مکاں اور زندگی کے پُورے احاطے میں پھیل گیا، میرا قلم بڑی تیزی کے ساتھ زندگی سے بھرپُور تصویریں بنانے لگا۔ انسان کے غم کی اور خوشیوں کی، اُمیدوں کی اور نا اُمیدیوں کی...... ناکردہ گناہوں کی حسرت کی اور کردہ گناہوں کی پاداش کی۔

پھر میں نے اعتماد کے ساتھ اپنی نئی کہانیاں وقت کے بادشاہ کے سامنے رکھ دیں۔ لیکن بادشاہ کو میری یہ نئی کہانیاں پسند نہ آئیں، نئے زمانے کے نئے بادشاہ کو...... جس کا مُلک اپنا تھا، آرزوئیں اپنی تھیں، خواب اپنے تھے۔

لیکن اُس نے اپنے آپ کو اپنے دل کے آئینے میں دیکھنا پسند نہیں کیا، اور ایک دن......

وہ شام بڑی سہمی سی تھی۔ جب مُلک کے ایک گمنام ادیب کی لاش دریا کے کنارے پڑی ہوئی ملی تھی، اُس کی جیبوں سے ایک خط کے سِوا اور کچھ نہ نکلا، خط میں اُس نے اپنی موت کی پیشن گوئی کی تھی، کیونکہ پچھلے ایک ہفتے سے وہ بخار سے جھلس رہا تھا اور اپنے علاج کے لئے اُس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔



محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے

ضلع مُظفر نگر یو پی کے چھوٹے سے غیر اہم اور ہر لحاظ سے پسماندہ گاؤں لدووالا میں یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی کہ محمد انور حجام کا اکلوتا بیٹا محمد شمیم بہتر روزگار کی تلاش میں کشمیر جا رہا ہے۔ محمد انور با اخلاق تو تھا ہی، غضب کا کاریگر بھی تھا۔ اُس کی جوانی کے دِنوں میں دلیپ کمار، راج کپور اور دیوانند کا طوطی بولتا تھا۔ اور اُس نے مظفر نگر کے راکسی تھیٹر کے عقب میں واقع بمبئی ہیر کٹنگ سیلون میں ملازمت اختیار کی تھی۔ محمد انور کا ہاتھ بھی صاف تھا، زبان بھی صاف تھی اور دل بھی صاف تھا۔ گاہکوں کی دلجوئی کے تمام رموز واسرار سے واقف تھا گاہک کو عزت کے ساتھ کُرسی پر بٹھا کر اُس کے بالوں اور شکل وصورت کا بغور جائیزہ لیتا۔ اُس کی اس گہری دلچسپی کو دیکھ کر گاہک خوش بھی ہوتا اور چوکنا بھی اور اُس کے بیٹھے ہوئے بال کھڑے ہو جاتے۔ تب محمد انور کچھ دلبری سے کچھ تاسف سے سر ہلاتا۔ کسی ماہر سنگ تراش کی طرح آنکھیں بھینچ کر گاہک سے مخاطب ہوتا۔

''میاں جی۔ اگر آپ کے بالوں کی کچھ اس طرح سیٹنگ کی جائے کہ سامنے سے بالوں کو چھیڑا نہ جائے صرف پیچھے اور کنپٹیوں پر ہلکی مشین چلائی تو آپ کے بالوں کا سٹائل دلیپ کمار کے بالوں جیسا بن سکتا ہے۔'' یہ کہ محمد انور

گاہک کے سر کے سامنے سے بالوں کا گُچھا ماتھے پر لہراتا اور گاہک کو پکا یقین ہو جاتا کہ اُس کے بالوں کی آوارہ لٹ دلیپ کمار یا دیوانند کے بالوں کی طرح ماتھے پر جھول رہی ہے۔

محمد انور حجام کا بوڑھا باپ محمد نعیم بھی اپنے زمانے میں غضب کا کاریگر تھا۔ ایک دھنگے میں مارا گیا بلوائی گاؤں کے نہ تھے۔ باہر کے تھے شاید دِلی سے آئے تھے۔ محمد انور کی سمجھ میں ایک بات نہ آئی کہ اُس کے باپ کے سینے کے سرخ باغ میں چاقو کیوں اُتارا گیا۔ اُس نے کونسا قصور کیا تھا۔ وہ تو سیدھا سادا حجام تھا۔ اُس کا باپ بھی حجام تھا۔ وہ سیدھا سادا مسلمان تھا۔ مکڑی کو مارنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ مکڑی دیکھتے وقت اُس کے ذہن میں ایک غار کی شبیہ عود کر آتی جس کے سامنے ایک مکڑی اپنا جال بُن رہی ہوتی۔ رام بھروسے کھیت مزدور جو ہمسائیگی میں رہتا تھا نے محمد انور کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آنسو صاف کیئے، کھانا کھلایا۔

سب کے باپ مرتے ہیں اور سب کی شادی ہوتی ہے۔ محمد انور کی شادی مظفر نگر کے ایک اور پسماندہ گاؤں کشن پور میں ہوئی۔ حجاموں کے گھر میں۔ فاطمہ کا رنگ ذرا سا گندمی تھا۔ شیام رنگ، پلکیں بڑی بڑی، بھاری بھاری، بات رُک رُک کے کرتی تھی۔

بازار سے......اچھے اچھے......ٹماٹر لانا، محمد انور اپنی مقراض سے کچھ اُلجھ سا جاتا۔ اُس کا جی چاہتا قینچی کنگھا رکھ کر گھر پہنچے۔

محمد شمیم کو جنم دیکر فاطمہ ایکدم خاموش ہوگئی۔ رُک رُک کے بولنا، بھاری

پلکیں اُٹھانا مکمل طور خاموش ہونے سے پہلے وہ ایک لمبا سانس لے کر وہ گئی جس میں محمد انور کو ہزاروں دلنشیں خوابوں کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔

''فاطمہ یہ وعدہ تو نہ تھا'' رام بھروسے کی ماں اور بیوی نے گھر کو سنبھالا، رام بھروسے مولوی صاحب اور مولون کو بلا کر لے آیا...... رام بھروسے کی بیٹی نے محمد شمیم کو دودھ پلایا۔

سب پیدا ہونے والے بچے مرتے نہیں...... سب نوزائید بچوں کی مائیں نہیں مرتیں۔ جن بچوں کی مائیں مرتی ہیں اُنھیں گائے بکری کا دودھ بھی پلایا جاتا ہے۔ رام بھروسے کی بیٹی بھی ان ہی دنوں ایک بچے کو جنم دے چکی تھی۔ محمد شمیم کو گائے بکری کا دودھ نہیں پینا پڑا۔

محمد شمیم دس سال کا ہو گیا۔ گاؤں میں دو سکول کُھل چکے تھے۔ لیکن محمد انور کے دل میں فاطمہ کا رُک رُک کے بولنا کچھ اس طرح بولتا رہا کہ اُس کے دل میں ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ محمد شمیم کو سکول میں ڈالنا ہے۔ حالانکہ محمد شمیم کے پیدا ہونے سے پہلے ہی وہ فاطمہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ محمد شمیم کو مُظفر نگر کے سب سے بڑے سکول میں داخلہ کرا دے گا۔ لیکن وہ وعدہ ہی کیا جو پورا نہ کیا جائے۔

محمد شمیم بڑا ذہین لڑکا نکلا۔ سال دو سال میں باپ دادا کا ہُنر سیکھ لیا اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو شاہ رُخ خان، اکشے کمار اور جان ابراہیم کا طوطی بول رہا تھا۔ پھر ایک دن محمد انور کو رام بھروسے کے داماد دیپک نے خبر دی کہ محمد شمیم بہتر روزگار کی تلاش میں کشمیر جا رہا ہے اور یہ خبر سُن کر محمد انور کو یوں لگا جیسے فاطمہ کو ایک مرتبہ پھر قبر میں اُتار رہا ہو۔

''بیٹا...... کشمیر جل رہا ہے۔''

''ابو۔ کشمیر میں کام ہے وہاں دام بھی اچھے ملتے ہیں''

''وہاں خون خرابہ ہے......رام پور جاؤ، سہارن پور جاؤ، بریلی جاؤ، آگرہ جاؤ، اتنے بڑے بڑے شہر ہیں یہاں۔ تم بڑھیا کاریگر ہو کہیں بھی کام مل سکتا ہے...... کشمیر جانا کیا ضروری ہے۔ وہاں زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔!''

''زندگی کا بھروسہ۔ یہاں مظفر نگر میں ہے؟ دلی میں ہے؟ ابو جینا مرنا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کل مظفر نگر میں آتش بازی کی فیکٹری میں آگ لگ گئی۔ نو آدمی زندہ جل گئے اور پھر نبی تاجدار ﷺ نے بہتر روزگار کی تلاش کے لئے ہجرت کی بھی اجازت دی ہے۔''

''لیکن تم کشمیر میں رہو گے کہاں......کھاؤ گے کیا۔؟......''

''ان سب باتوں کا بندوبست ہو چکا ہے ابو۔ آپ بے فکر رہیئے اور کشمیر زیادہ دور نہیں پڑتا۔ دو دن کا سفر ہے اور میں ہر دن فون کیا کروں گا۔''

''بیٹا شمیم...... مجھے فکر رہے گی۔''

''وہ تو یہاں لدو والا میں بھی تمہیں لاحق رہتی ہے۔ مظفر نگر جاتا ہوں تو تم گاؤں کے چکر لگاتے ہو۔ تمہیں میری فکر لگی رہتی ہے۔ وسیم بھائی نے وہاں چھانہ پورہ میں دُکان لی ہے، اچھا دھندا چلتا ہے۔ وسیم بھائی کے ساتھ رہوگا۔ کھانا پینا......وسیم بھائی نے انتظام کیا ہے تنخواہ بھی مقرر کی ہے......

محمد انور ایک مرتبہ پھر پُر ہول سناٹے کی گونج میں بہرا بن گیا۔

ٹھیک اُسی شام کو جب صبح محمد شمیم کشمیر جانے کے لئے دلی جا رہا تھا دروازے پر کچھ شور سا بُلند ہوا۔

دروازے پر رام بھروسے کا لڑکا دیپک تھا اور اُس کے پیچھے سوٹ بوٹ پہنے ایک ادھیڑ عمر کا خوبرو لمبے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ ...... کنپٹیاں سفید...... اُس سے لگ کر دو عورتیں کھڑی تھیں۔ ایک چالیس پینتالیس کی۔ فربہ لیکن پُر وقار، گہرے سبز رنگ کی ساڑھی، دراز قد تیکھے نقوش...... رنگ صاف طباشیر کی طرح اُس کے ساتھ بیس بائیس برس کی نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ فاطمہ کی طرح اُس کی پلکیں بھی بھاری بھاری سی تھیں۔ چہرہ صاف اور روشن جیسے صبح مسکرا رہی ہو جیسے شبنم رات بھر آسمان کا چہرہ دھوتی رہی ہو محمد انور کو دروازہ کھولتے دیکھکر اُس نے لمبی گردن میں پڑا ڈوپٹہ سینے پر لہرایا۔

''میرا نام وجے...... وجے دھر ہے...... میں مظفر نگر میں کلکٹر ہوں۔ یہ میری بیوی لاجونتی اور یہ انجلی...... میری بیٹی...... ہم کشمیری ہیں۔ ہم محمد شمیم سے ملنے آئے ہیں جو کشمیر جا رہا ہے۔''

محمد انور نے عجلت میں مختصر سے باورچی خانے کے متصل چھوٹے سے مہمان خانہ میں پُرانی چٹائی پر تہہ کی ہوئی چادر بچھائی اور دونوں باپ بیٹے مہمانوں کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ رام بھروسہ کا لڑکا دیپک شمیم کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔

کنویں کا پانی پی کر، وجے دھر نے محمد شمیم سے کہا۔

"اچھا کر رہے ہو تم۔ کشمیر بہت اچھی جگہ ہے۔ وہاں کے لوگ بھی اچھے ہیں۔ پانی بھی اچھا ہے۔ اور ہوا بھی اچھی ہے۔"

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ بن ماں کا بچہ ہے۔ پردیس کا معاملہ ہے اور وہاں خون خرابہ بھی بہت ہو رہا ہے" محمد انور نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

کچھ پرواہ نہیں۔ وجے دھر نے پانی کا ایک اور گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ محمد شمیم کو کشمیر میں آنچ بھی نہ آئے گی۔ وہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ ہم تب تک خود کھانا نہیں کھاتے جب تک نہ گھر بلائے ہوئے مہمان کی دلجوئی کرتے ہیں۔ میرے کشمیر کا ذرہ ذرہ مہمان نواز ہے۔"

"سنا ہے وہاں کے لوگ چائے میں نمک ڈال کر پیتے ہیں"

"ہاں...... لیکن وہاں مٹھائی بھی بہت ہوتی ہے۔ وہاں شکتی سوئیٹس مٹھائیاں بیچنے کی سب سے بڑی دُکان ہے۔ شادی بیاہ اور کسی خوشی کے موقعے پر شکتی سوئیٹس کی مٹھائی موجود نہ ہو ممکن نہیں"۔

"وہاں دین مذہب پر کوئی پابندی ہے؟"

"یہ آپ سے کس نے کہا، وہاں شہر کے سب سے گنجان آباد علاقے مہاراج بازار میں کشمیر کی سب سے پُرانی اور مشہور کتابوں کی دُکان ہے۔ جے رام داس کی دکان۔ جے رام داس لاہور کی تاج کمپنی سے قرآن شریف منگوایا کرتے ہیں۔ قرآن شریف رکھنے کی خاص جگہ دُکان کے اندرونی حصے میں بنی ہوئی ہے جس میں ہر دم مسحور کُن اگربتی کی خوشبو روح کو تازہ کرتی ہے۔ کوئی گاہک قرآن شریف خرید نے دکان پر آتا ہے تو جوتے باہر نکالنے پڑتے ہیں اور جے رام داس

ملازموں کی بجائے خود احترام کے ساتھ قرآن شریف دکھاتے ہیں۔

تُل مُل کے مندر میں بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ بھوانی دیوی کا مندر ایک چشمے میں بنا ہوا ہے چشمے کا پانی رنگ بدلتا رہتا ہے کبھی بلوریں، کبھی ماں کے دودھ کی طرح سفید، کبھی ہلکا گلابی۔ یہاں پرشاد اور دودھ بیچنے کی سینکڑوں دکانیں ہیں۔ سب مسلمانوں کی ہیں۔

اندرانگر کے مہاراج کرشن اور دھیرج کمار نے مل جل کر کاروبار شروع کیا۔ پہلے اچھے دوست تھے ایک بہت بڑا فائیو سٹار ہوٹل بنایا...... پیسہ دیکھ کر دھیرج کمار کی نیت میں فتور آ گیا اُس نے دلی جا کر نقلی کاغذات بنوائے۔ ہوٹل دو کروڑ میں فروخت کیا۔ مہاراج کرشن کے تمام ہمسایوں نے جو سب کے سب مسلمان ہیں حکام کے سامنے دھرنا لگایا۔ مہاراج کرشن کو حق دلوایا۔ کس کس کا ذکر کروں۔ ہمارے یہاں بھی ایک پریم چند پیدا ہوا تھا، پریم ناتھ پردیسی جو غریب مفلس مسلمانوں کے لئے آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔ آج بھی ویریندر پٹواری، دیپک کَنول دیپک بُدکی بہت بڑے کہانی کار ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں کشمیر کا دل دھڑکتا ہے۔ بیٹے کشمیر ضرور جاؤ۔ تمہیں وہاں کے ہر کوچے میں، ہر گلی میں ماں کی ممتا ملے گی۔ وہاں دُلہن، مہارانی کہلاتی ہے، اور دولہا مہاراجہ، دولہا دُلہن مسلمان ہوں یا ہندو۔ شادی ایک ہی طریقے سے ہوتی ہے۔

وجے نے تھوڑا سا پانی اور پی لیا انگوٹھے سے آنکھ کا پانی صاف کیا۔

''سُنا ہے وہاں جاڑا بہت سخت ہوتا ہے......''

''ہاں سردی بہت ہوتی ہے، برفباری ہوتی ہے۔ لیکن سب لوگ، مرد ہو یا عورتیں، ا

ہندو ہو یا مسلمان سبھی پھرن پہنتے ہیں۔تم بھی ایک بنوالینا......اور کانگڑی لے کر گرتی ہوئی برف کو دیکھنا...... بڑا مزا آتا ہے۔اور اگر ہو سکے تو اچھی سی لڑکی سے بیاہ رچانا۔ مجھے بھی بلانا۔"

"آپ نے کشمیر کیوں چھوڑا"؟

نہیں بیٹا ہم نے کشمیر نہیں چھوڑا۔ہم کو کسی نے کشمیر چھوڑنے پر مجبور نہ کیا۔ یہ تقدیر کا کھیل تھا۔ کچھ لوگ ناراض تھے۔اُن کے سر پر ہاتھ رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ سیاست گردانوں نے فائدہ اُٹھایا۔ شیخ پورہ بڈگام میں ہمارا حویلی نما گھر ہے، زمین ہے جائیداد ہے اور ہمارے خواب ہیں ہم اپنے سارے خواب گھر کے قریب کھڑے ایک چنار کی گھنی چھاؤں میں چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ میری شادی پر سارا بڈگام اُمڈ آیا تھا۔ پنڈت بیر بل دھر کے پوتے کی شادی تھی۔ ہیڈ ماسٹر بل بدر دھر کے بیٹے کی شادی تھی مسلمان عورتوں نے (ونہ وون) گائیے۔ برات کے ساتھ چلیں ......دور آستان مرگ کی بید لرزاں کی جھاڑیوں میں خنک ہوا کے جھونکے یوں سرسرا رہے تھے جیسے جنت کے تمام دریچے کھول دیئے گئے ہوں۔

یہاں اس دور دراز گاؤں میں آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے ہیں؟ محمد شمیم کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

ہماری شادی کو تین سال بیت گئے تھے، لاجونتی ماں نہ بنی۔ میری ماں کو دادی بننے کا ارماں تھا جس طرح سے سب ماؤں کو ہوتا ہے۔ پھر شادی کا پانچواں سال بھی گذر گیا۔ ہزار ڈاکٹری علاج کروایا پیسہ پانی کی طرح بہایا۔

لیکن اولاد کی نعمت سے ہم محروم رہے ماں نے ہر تیرتھ استھان، ہر درگاہ میں حاضری دی۔ پھر شیخ پورہ کی سب سے بُزرگ عورت خدیجہ ماسی نے حضرت بابا ریشی کے روضہ پر حاضری دینے کو کہا۔ روضہ مبارک پر مٹی کا بنا ہوا ایک چولھا ہے۔ وہاں جا کر حاجت مند عورتیں چولھے کی لپائی کرتی ہیں ......ہم بھی بابا ریشی کی زیارت گاہ پر گئے۔ ہم نے دعا مانگی، میری ماں بہت روئی، لاجونتی نے چولھے پر لپائی کی اور مقدس دھاگا باندھا اور ٹھیک ایک سال کے بعد انجلی پیدا ہوئی۔ یہ ہے انجلی......

وجے دھر نے قریب بیٹھی ہوئی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر ساگر ہوا۔ بہت بڑا ڈاکٹر ہے.. دل کا۔ اِدھر دلی میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتا ہے۔ انجلی کی بھی شادی ہوئی ہے......اس کی شادی کو تین برس ہوئے ہیں لیکن انجلی اب تک ماں بننے کی نعمت سے محروم ہے۔ چند روز پہلے کشمیر کے ایک آشنا سے ملاقات ہوئی۔ اِدھر مُظفر نگر میں ہمارے گھر میں کھانا کھایا، ہم نے اپنی بیتابی سُنائی، اُس نے بابا ریشی کے آستانہ پر حاضری دینے کے لئے کہا۔ ہم ابھی کشمیر جانے کے لئے تیار نہیں ......سوچتے ہیں ہفتہ دو ہفتہ کے لئے گھر چھوڑا تھا گھر کی چابیاں اپنے مسلمان ہمسایوں کے ہاتھ میں ڈال کر آئے تھے۔ اب سولہ سال گذر گئے سولہ یگ بیت گئے ہیں۔ آسمان دور ہے۔ عشق پہچان کے رنگ، کنوارے خوابوں کی دمک، کچھ اُلجھن نہیں، ڈر نہیں۔ بس شرمندگی ہے، ہم شرمسار ہیں ہمارے ہمسائے بھی اپنے آپ کو گنہگار سمجھ رہے ہیں ہمیں روکا نہیں۔ یہ ہم نے مظفر نگر میں سُنا ہے کہ تم کل صبح

کشمیر کے لئے روانہ ہورہے ہو۔

''جی ہاں......''

تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔ یہ پانچ ہزار روپے ہیں۔ تمہیں ہمارے لئے ٹنگمرگ جانا ہوگا۔ وہاں سے بابا ریشی کے آستانہ پر حاضری دینی ہوگی۔ وہاں چولھے کی لپائی کرنا ہوگا۔''

''میں...... یہ کام کرسکوں گا؟''

''وہاں بہت ساری عورتیں ملیں گی۔ کسی لڑکی سے کہنا۔ میری بہن کے نام چولھے کی لپائی کیجئے۔ تمہیں وہاں ضرور کوئی لڑکی ملے گی۔ انجلی جیسی۔ پھر آستانہ پر دھاگا باندھنا۔ یہ نیاز چڑھانا۔''

انجلی کے لئے دعا کرنا......

دوسری صبح اپنا مختصر سامان لے کر محمد شمیم دلی کے لئے روانہ ہوا۔ جہاں سے اُسے جموں جانے کے لئے ریل پکڑنا تھی۔ رات کو وہ نہ سو سکا نہ جاگ سکا......البتہ نصف شب اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اُس نے خواب میں ایک ہری بھری چراہ گاہ دیکھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی۔ وادی کے بیچ میں کسی بزرگ کا مزار دیکھا۔ مزار کے قریب مٹی کا ایک چولھا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ کوئی عورت چولھے کی لپائی کررہی ہے۔ پھر کسی نے کہا کہ وہ فاطمہ ہے۔ جس نے اُسے جنم دیا تھا جسے اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔



مُردہ چنار

ہَوا کا وہ جھونکا نہ جانے کہاں سے آیا اور آ کر بوڑھے چنار کے مضبوط تنے سے ٹکرایا۔ بوڑھا چنار جو سبز مخملی لباس پہنے جھوم رہا تھا اس ہَوا کے جھونکے کا لمس پاتے ہی گھبرا سا گیا اور بیحد خوفزدہ ہوا، کیونکہ یہ جھونکا خزاں کی خنکی کا لمس ساتھ لئے ہوئے تھا۔

''تو خزاں آ ہی گیا......'' بوڑھے چنار نے سوچا...... ''یہ خوشیوں کے موسم بھی کسقدر جلد گذر جاتے ہیں، اب میرے ان سبز مخملی پتوں میں آگ لگ جائے گی، شفق اور میرا رنگ ایک ہو جائے گا۔ یہ میری زندگی بھی کتنی عجیب ہے، ہر سال میں پیدا ہوتا ہوں اور ہر سال برف مجھ پر اپنا کفن اوڑھ لیتی ہے، بہار آتی ہے تو ننھی ننھی کونپلیں میرے جسم پر اپنی ننھی آنکھیں کھولتی ہیں، پھر ان کونپلوں سے پتے نکلتے ہیں، سبز سبز مخملی...... میرے ان پتوں کا رنگ کس کارخانے میں تیار ہوتا ہے۔ میرے ان پتوں کو کون اس نفاست اور خوبصورتی سے تراشتا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے موسم بدل جاتا ہے مخمل کھردری ہو جاتی ہے، سبز رنگ نارنجی ہو جاتا ہے اور میں مر جاتا ہوں۔

میں مرتا ہوں تو رحمان جاروب کش کو زندہ رہنے کی اُمید نظر آتی ہے وہ میرے نارنجی پتے جمع کرتا ہے، اُن میں آگ ڈالتا ہے میرے پتے اور

سرُخ ہو جاتے ہیں، انسان کے خون سے بھی زیادہ سُرخ، تب رحمان کی بیوی کے مدقوق رُخساروں پر شفق کی سی چمک پیدا ہوتی ہے اور رحمان کے چھوٹے چھوٹے غلیظ بچوں کے چہرے بھی تانبے کی طرح چمکنے لگتے ہیں، پھر میری تمام سُرخی غائب ہو جاتی ہے اور میرے خوشنما پتّے کالے ذرّات میں تبدیل ہو جاتے ہیں جیسے شفق تاریکی کے گلے لگ جاتی ہے۔ پھر رحمان کوئلوں کو کپاس کی غلیظ کھر دری خستہ حال بوریوں میں بھر کر اپنی جھونپڑی کے ایک تنگ و تاریک گوشے میں ڈال لیتا ہے۔ رات کو سوتے وقت ایک نظر اپنی بے سُدھ پڑی ہوئی بیوی پر ڈالتا ہے پھر میرے کوئلوں پر نظر ڈالتا ہے اور دوسرے ہی لمحے اُسے برف یاد آجاتی ہے، سفید برف جو بہت ٹھنڈی ہوتی ہے جو میری لاش پر کفن کی طرح لپٹ جاتی ہے۔ برف کے ٹھنڈے تصور سے وہ جُھر جُھری سی لیتا ہے، کیونکہ جب برف گرتی ہے تو سردی سانپ کی طرح ڈستی ہے۔ سردی کے احساس سے اس کو کانگڑیاں یاد آجاتی ہیں۔ جو ابھی خریدنی ہیں اور اُس کی آمدنی قلیل ہے۔ آسمان بے رحم ہے، تب اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور پھر بیڑی کا آخری بھرپور کش لے کر بتی کو پھونک مار کر بجھا دیتا ہے۔!

جس دن چنار کے تنے سے ہوا کا وہ خنک جھونکا ٹکرایا اس دن وہ بہت اُداس رہا یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ اور اس کے نیچے بیٹھا ہوا جوڑا اُٹھ کر چلا گیا۔ اُن کے جاتے ہی یہاں سے رحمان جاروب کش کا چھوٹا لڑکا گزرا۔ چنار کے قریب پہنچکر وہ رُک گیا اور اپنی چھوٹی چمکیلی آنکھیں چنار کی

طرف اُٹھا دیں بوڑھے چنار نے بھی اس کو اپنی ان دیکھی آنکھوں سے دیکھا اور جب دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو چنار کو اپنے جسم کے اُس حصّے میں جہاں دن کے وقت وہ منحوس ہَوا کا جھونکا ٹکرایا تھا ہزاروں زہریلی سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہُوئیں، چنار نے اپنے آپ سے کہا...... ''کم بخت کن حریص نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اے غلیظ لونڈے میرے پتّے ابھی سبز ہیں، ابھی دو ماہ کے بعد سُرخ پڑ جائیں گے۔ چل بھاگ یہاں سے''۔

لیکن رحمٰن کا لڑکا گیا نہیں، گہری نظروں سے چنار کو دیکھتا رہا جس طرح وہ سردیوں کے دنوں میں پاس والی کوٹھی کے بچوں کو دیکھتا رہتا ہے جو گرم گرم کوٹ، لمبے لمبے سیاہ جوتے پہنے برف کا آدمی بناتے ہیں۔ اپنی جھونپڑی کے دروازے سے لگ کر وہ دیکھتا رہتا ہے اور پیٹ کے ساتھ لگی ہوئی کانگڑی کو اتنے زور سے دبانا شروع کرتا ہے جیسے اُس کی آگ کو پیٹ کے اندر ڈالنا چاہتا ہو۔ کوٹھی والے بچے برف کے آدمی کی آنکھوں میں بڑے بڑے کوئلے ڈالتے ہیں۔ اس عمل کے دوران بہت سارا کوئلہ ضائع ہو جاتا ہے وہ اپنے ڈیڈی کی ہیٹ برف کے آدمی کے سر پر رکھتے ہیں اور اُس کے گلے میں ڈیڈی کا مفلر ڈالتے ہیں۔ پھر اُن کی ماں جو گرم اُونی شال میں لپٹی ہوتی ہے، باہر آتی ہے۔ بچوں کی شرارت دیکھ اس کے موتیوں جیسے دانت نمودار ہُوتے ہیں، پھر وہ پیار سے اُنھیں ڈانٹتی ہے ''بچو اندر چلو سردی لگ جائے گی، تمہارے لئے کافی تیار ہے''۔ اور عین اُسی لمحے رحمان کی بیوی اپنے لال سے کہتی ہے۔

''بد بخت......ابھی تو تماشا دیکھ رہا ہے جا لکڑیاں چُن کے لا''۔

رحمان کا لڑکا آہستہ سے چنار کی طرف بڑھا اور اپنی پتلی پتلی اُنگلیاں چنار کے کھردرے تنے پر پھیرنے لگا۔ بوڑھے چنار کی نایدہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ دن کے وقت لگنے والے ہوا کے اس خنک جھونکے اور لڑکے کی اُنگلیوں کے لمس میں کوئی فرق نہ تھا۔ چنار ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ یکا یک لڑکے نے اپنے پھٹی ہوئی نِکر کی جیب سے لوہے کا ایک پترا نکالا اور اس سے چنار کے تنے کو چھیلنے لگا۔ بوڑھا چنار درد سے کراہ اُٹھا۔ لیکن لڑکا تنا چھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کے قدموں پر بہت سارے چھلکے جمع ہو گئے۔ چھیلتے چھیلتے ایک بار بے خیالی میں اُس نے ایک وار اپنے ہاتھ پر بھی کیا، اُس کے مُنہ سے ''سی'' کی آواز نکلی۔ جہاں پر ہاتھ چھل گیا تھا وہاں سے لال لال خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی تھی۔ چنار کو وہ دن یاد آیا جب کوٹھی والے بچے کا ہاتھ پنسل بناتے بناتے چھل گیا تھا، بوڑھے چنار نے سوچا رحمان کا لڑکا بھی اُسی انداز سے چیخنے لگے گا، اس کی ماں چیخ سُن کر دوڑی دوڑی آئے گی اور اُسے اپنے سینے سے لپٹا لے گی لیکن وہ بالکل چیخا نہیں، اُس نے ہاتھ کا وہ حِصہ جہاں سے خون رس رہا تھا اپنی نکر پر رگڑا، پھر ایک نظر چنار کی طرف اُٹھا دی اور پھر چھلے ہوئے چھلکے اُٹھا کر اپنی جھونپڑی کی طرف دوڑ پڑا اس کی نِکر کے پیچھے سُرخ دھبہ صاف نظر آ رہا تھا، بوڑھے چنار نے نفرت سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''کتنے چھوٹے اور کمینے ہیں یہ جھونپڑی والے۔ بد تہذیب، بد اخلاق،

ان کو بس پیٹ اور آگ کی فکر رہتی ہے، یہ بدصورت لوگ میری خوبصورتی کیا جانیں۔ یہ انتظار میں لگے رہتے ہیں کہ کب میرے پتے سُرخ ہو جائیں تو اُن کے دل کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے، میری قدر تو یہ کوٹھی والے تہذیب یافتہ لوگ کرنا جانتے ہیں، اس کوٹھی میں رہنے والی خوبصورت جوان لڑکی جس کے بال میرے خزاں کے پتوں کی مانند سُرخ ہیں، جب اپنے گورے گورے ملایم ہاتھوں سے مجھے کینو اس پر دلکش رنگوں سے سجاتی ہے تو اس کی ماں کتنی خوش ہو جاتی ہے۔"

لیکن جب رات ڈھلنی شروع ہوئی اور کوٹھی کی روشنیاں ایک ایک کر کے بُجھنے لگیں اور رحمان کی جھونپڑی سے کراہنے کی آوازیں آنے لگیں تو نہ جانے کیوں بوڑھے چنار کو جھونپڑی میں رہنے والوں پر رحم آنے لگا وہ سوچنے لگا کہ اگر میں مر نہ جاؤں تو یہ کیسے زندہ رہ سکیں گے اُس کو وہ دن یاد آیا جب رحمان اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ "یہ چنار نہ ہوتا تو سردی سے ہم لوگ مر جاتے، اللہ بھی کتنا کارساز ہے"۔ اور پھر بوڑھے چنار کو وہ گیت یاد آیا جو رحمان کی بیوی اس کے پتے جمع کرتی ہوئی گاتی ہے۔ کیسا گیت ہوتا ہے وہ، دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں، وہ گیت جس کے ہر مصرعہ میں نئی لے کی چمک ہوتی ہے اور جس کی ہر لے میں لاکھوں بے بس انسانوں کی آرزوؤں کی گونج ہوتی ہے۔

جاڑا بیت جائے گا۔
اور برف پگھل جائے گی
اور بہار آجائے گی۔!!

تب بوڑھے چنار کی اَن دیکھی آنکھیں خون کے آنسو بہانے لگیں......
اس کا جی چاہا کہ اس کے پتّے پل بھر میں سُرخ ہو جائیں اور پھر چیخ چیخ کر جاروب کش کی بیوی سے کہے۔ ''جلدی آؤ...... میرے پتے جمع کرو...... مجھے وہ گیت سناؤ!!

دوسرے دن سے بوڑھا چنار خزاں کی خنک ہَواؤں سے رتی بھر بھی خوفزدہ نہ ہوا، اسی کے سبز مخملی پتے آہستہ آہستہ سُرخ ہونے لگے، اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب اس کا پہلا سرُخ پتہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑا، رحمان جاروب کش کا لڑکا اس پتے کو دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ جلدی سے آگے بڑھا اور پتّے کو اُٹھا کر اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے ماں باپ اور بہن بھائی سبھی باہر آ گئے اور حیرت سے چنار کو دیکھنے لگے...... بوڑھا چنار چپکے سے مُسکرایا۔!!

پھر جب شام کی ہوائیں زیادہ خنک ہونے لگیں اور دور مغربی پہاڑوں پر سال میں پہلی برف گری تو چنار کے سارے پتے سرُخ ہو کر زمین پر گر گئے پھر ایک چمکیلی صبح کو رحمان اس کی بیوی اور اُس کے سب بچے پتوں کو ڈھیروں میں جمع کرنے لگے۔ رحمان کی بیوی ہلکی لے میں گانے لگی جیسے برف گر رہی ہو۔

جاڑا بیت جائے گا
برف پگھلے گی
اور بہار آئے گی...... کہ اتنے میں زور سے ایک بڑی سی گاڑی اُن کے

سامنے رُک گئی۔ اُن کے ہاتھ رُک گئے وہ......سب گاڑی کو دیکھنے لگے گاڑی کا پٹ کھل گیا اور موٹی توند والا آدمی باہر آ گیا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور اُترے۔ موٹی توند والے نے پہلے اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں پھر رحماؔن سے بولا:۔

''تم یہ پتّے جمع کیوں کر رہے ہو''۔

رحماؔن نے پہلے اس کو حیرت سے دیکھا پھر بولا۔

''جناب ہم ہر سال جمع کرتے ہیں......''

''جناب کے بچے......ہم نے اس سال اس باغ کے تمام چناروں کو خریدا ہے چلو بھاگو یہاں سے......'' موٹی توند والا گرجا۔

''جناب......''! رحماؔن نے ہاتھ جوڑے۔

''کلّو۔ منجے......'' موٹی توند زور سے ہلی...... ''کھڑے کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بھگادو انھیں یہاں سے......''

وہ دونوں آدمی رحمان اور اُس کے بچوں کی طرف بڑھے۔ رحماؔن کی لڑکی اپنی ماں سے لپٹ گئی، اور رحمان کے لڑکے نے چنار کی طرف اپنی نظریں اُٹھادیں، لیکن اُس کا آخری پتّا تو کب کا ٹوٹ کر زمین پر آ گیا تھا۔!!



بَرف کے پھُول

ہاتھ میں نہ مکان کی چھت بدلنے کے لئے پیسہ تھا اور نہ احمد کی شادی کے لئے۔ اس کے باوجود احمد کے ماں باپ بضد تھے۔ کہ مکان کی چھت بدلی جائے یا نہ بدلی جائے، ہمارے احمد کی شادی اسی سال ضرور ہو جانی چاہئے احمد کو یہ دونوں کام ناممکن نظر آرہے تھے۔ لیکن جہاں مکان کی چھت بدلنا ضروری تھا۔ وہاں شادی کرنا بھی ضروری تھا۔ اگر مکان کی چھت اس برس بھی نہ بدلی جاسکی تو سرما میں یخ آلودہ برف زندہ نہ رہنے دے گی۔ گذشتہ برس ٹین کے خالی کنستروں کو سیدھا کر کے چھوٹے بڑے سوراخ وقتی طور بند کئے گئے تھے لیکن اب وہ بھی سڑ چکے تھے۔ چھت کو سہارا دینے والی لکڑی گل سڑ گئی تھی۔ برف کے بوجھ سے چھت کے بیٹھ جانے کا اندیشہ تھا اور شادی اس لئے ضروری تھی کہ آمنہ کے باپ نے صاف صاف الفاظ میں کہا تھا۔ کہ وہ اب مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ اسی لئے احمد خود اپنے آپ کے ساتھ اُلجھا ہوا تھا اور جب انسان خود اپنے آپ کے ساتھ اُلجھ کے رہ جاتا ہے۔ تو ہر چیز بے معنی سی لگتی ہے۔ بے روح اور بے رنگ اور شاید ایسے ہی موقعوں پر انسان جزیرہ بن کے رہ جاتا ہے۔ انسانوں کے سمندر میں رہتے ہوئے بھی الگ تھلگ اور تنہا۔

آج بھی جب وہ کام سے گھر لوٹا تو بوڑھے باپ نے حقّے کے دو چار گہرے کش لے کر اس سے کہا۔ ''دیکھو بیٹا''۔ مکان بنانے کے لئے اور شادی کیلئے پیسے کسی کے پاس موجود نہیں ہوتے۔ یہ کام جب ہاتھ میں لیے جاتے ہیں تو اللہ ہاتھ بٹاتا ہے۔ مجھے دیکھو جب تمہاری اماں سے میری شادی کی بات چیت چلی تھی۔ تو گھر میں دو دن سے چولھا نہ جلا تھا لیکن صرف چھ ماہ بعد جب شادی ہوئی۔ تو میں نے تمہاری اماں کے لئے دس تولہ چاندی کے زیور اور سات جوڑے کپڑے بھی بنوائے تھے اور ساری برادری کو دعوت کھلائی تھی۔ اور بوڑھا باپ یک لخت خاموش ہو گیا۔ داڑھی کے بال گھاس کے خشک تنکوں کی طرح اکڑ کر رہ گئے۔ شاید اسے یاد آیا تھا۔ کہ دس تولہ چاندی سات جوڑے کپڑے اور ساری برادری کو دعوت کھلانے کے عوض اسے اپنی زمین گاؤں کے مہاجن کے پاس گروی رکھنا پڑی تھی۔ پندرہ برس تک سود ادا کرنے کے بعد بھی جب اُس سے پتہ چلا کہ اصل رقم اپنی جگہ موجود ہے تو وہی ہوا جو ایسے معاملات کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ مہاجن نے زمین پر قبضہ کر لیا۔

آج زمین سمٹ کر ایک چھوٹا سا دھبہ بن کے رہ گئی تھی۔ آسمان بہت دور نظر آ رہا تھا۔ اور مکان کی چھت کے لئے ٹین کی بیس چادریں درکار تھیں۔

بوڑھی ماں جو اتنے برسوں پُرانے چرخے کے پہیئے سے سر لگائے نہ سو رہی تھی نہ جاگ رہی تھی آنے والی سردیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جھیل میں کنول کے پھول سوکھنا شروع ہو چکے تھے۔ اس نے بہت پہلے اپنے بچپن میں اپنی ماں سے سُنا تھا۔ کہ جب جھیل میں کنول سوکھنے لگتے ہیں تو گرمی کا

زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ ''اب چناروں کے سبز مخملی پتے نارنجی پڑ جائیں گے پھر پتّے جھڑ جائیں گے۔ پھر زہریلی ہوا چلے گی۔ اور پھر زمین برف کا کفن اُوڑھے گی''۔

نہیں احمد کی شادی اس برس ہاڑ سے پہلے برف باری سے بہت پہلے ہو جانی چاہیئے۔

یکا یک وہ جاگ سی پڑی جسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑی ہو۔

''اماں میری شادی اتنی ضروری نہیں جتنی مکان کی چھت''۔

''بیس برس سے چھت نہیں بدلی جاسکی ہے۔ اب کیسے بدلی جاسکتی ہے''

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ اس یک منزلہ مکان کے دو باقی کمرے تھے۔ اور اس کے تیسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تینوں افراد بھی مکان کے خالی کمروں کی طرح اپنے آپ کو خالی خالی محسوس کرنے لگے۔ بوڑھے باپ کے سامنے جتنے راستے تھے وہ تھوڑی دور جا کر نا اُمیدیوں کی پھیلی ہوئی دُھند میں کھو جاتے۔ بوڑھی ماں کے پاس اپنے بوڑھے چرخے کی گھوں گھوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس لئے احمد اپنے آپ کے ساتھ اُلجھتا جا رہا تھا۔

رات خواب میں اس نے مکان پر نئی چھت بھی لگتے ہوئے دیکھی اور آمنہ کو اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں جھاڑو لگاتے بھی دیکھا۔ صبح اپنے خواب کا ذکر کسی سے نہ کیا نمکین چائے کی دو پیالیاں حلق سے انڈیل دیں۔ اتنی دیر میں بوڑھی ماں نے تانبے کے پُرانے برتن میں پکے ہوئے چاول بھر دیئے۔

دیئے۔ ان کے اوپر ساگ کی تہہ جمادی۔ پھر برتن کو ایک میلے کچیلے کپڑے میں باندھ لیا اور احمد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

زیر تعمیر سڑک پر آج بجری بچھائی جانیوالی تھی۔ تارکول کے بڑے بڑے ڈرموں کے نیچے آگ سلگائی گئی۔ مٹیالا دھواں سڑک کے کنارے کھڑے چناروں کے گرد ہالوں کی صورت میں جمع ہونے لگا۔ پھر اپنے آپ کے ساتھ اُلجھتے ہوئے احمد نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''یار......شادی پر کل کتنا خرچا آتا ہے۔''

یہ سوال تم مجھ سے ہزار بار پوچھ چکے ہو۔ اور میرے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے ساری دنیا کی دولت بھی خرچ کی جائے تو کم ہے۔

''کیا روپے پیسے کے بغیر شادی نہیں ہوسکی''۔

''ہاں کیوں نہیں۔ لیکن اس کے لئے تمہیں شہر جانا پڑے گا۔ اور عدالت میں جا کر نکاح پڑھوانے ہوں گے۔ احمد مزید اُلجھتا چلا گیا۔ کیا آمنہ اس بات کے لئے راضی ہوگی۔ خود اس کے ماں باپ رضامند ہوں گے۔ دنیا کیا کہے گی۔ اور مکان کی چھت......شادی بغیر روپے پیسے کے تو ہوسکتی ہے۔ لیکن ٹین کی چادریں۔ ان کے لئے کونسی عدالت ہے۔

شام کو جب بوڑھے باپ نے پھر سے شادی کی بات چھیڑی تو اس نے جُھنجھلا کر کہا۔ ابا۔ نہ شادی ہوگی نہ چھت بدلے گی۔ اب ہمارے پاس زمین کا معمولی سا ٹکڑا بھی نہیں۔ اور دو چار دن کے بعد گھر میں چولھا جلنا بھی بند ہو جائیگا۔ کیونکہ اب سڑک پر صرف دو یا تین دن کا کام رہ گیا ہے۔

''بیٹے ...... اللہ بڑا کارساز ہے۔'' بوڑھے باپ نے جواب دیا اور احمد یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ بوڑھے باپ کی زندگی کے تجربوں کا نچوڑ ہے یا بے بسی کا اعلان نئی سڑک کی تعمیر کا باقی ماندہ کام صرف تین دن میں مکمل ہوا۔ چوتھے روز ایک نہایت صاف ستھرے آدمی نے جو یہاں تک ایک کار میں بیٹھ کر آیا تھا۔ ایک رنگین فیتہ کاٹا اور سڑک آمدورفت کے لئے کھول دی گئی۔

سڑک پر جن مزدوروں نے کام کیا تھا انہیں قہوہ پلایا گیا۔ اور مزدوری کے علاوہ دس دس روپے انعام دیئے گئے۔

دوسری مہینے کی دس تاریخ کو بوڑھی ماں فجر ہونے سے پہلے ہی جاگ پڑی۔ یوں بھی وہ ہر روز فجر کے وقت جاگا کرتی تھی۔ لیکن آج وہ سوئی ہی کہاں تھی جھیل کی پرسکون سطح پر ہلکی ہلکی دھند چھائی تھی۔ پھر جب مسجد سے اذان بلند ہوئی اور کنول کے پتے نظر آنے لگے تو اس نے جھیل کے کنارے سبز مخملی گھاس پر فجر کی نماز ادا کی۔ جب اُس نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تیز برفیلی ہوا کا ایک جھونکا اس کی ہتھیلیوں سے ٹکرا گیا۔ اس نے متوحش نگاہیں آنگن میں کھڑے بوڑے چنار کی طرف اٹھادیں۔

''میرے اللہ یہ کیا..... ابھی تو چناروں کے پتے بھی سبز ہیں، ابھی برف باری کا موسم نہیں، لیکن میرے ہاتھوں سے برفیلی ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔ جب بارش ہوتی ہے تو ہوا اسقدر سرد نہیں ہو جاتی۔ یہ تو برف باری کی علامت ہے''۔ اس کی دعا طویل ہوتی گئی۔

آسمان ابر آلودہ ہونے کے باوجود گھر میں شادی کا ہنگامہ شروع ہوا۔ بڑا نہ سہی چھوٹا ہی سہی۔ ایک دُنبہ ذبح کیا گیا۔ بڑی بڑی دو دیگوں میں چاول چڑھا دئے گئے۔ عورتوں نے گیت گانے شروع کئے۔ بوڑھی ماں کانپ کے رہ گئی۔ ایک بار پھر آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا دیں۔

"نہیں ...... مالک...... آج نہیں۔" لیکن بوندا باندی رُکی نہیں۔ احمد اسی بوندا باندی میں دولھا بن کر سفید گھوڑی پر سوار ہوا۔ ایک پٹاخا داغا گیا۔ گھوڑی اچھل کے رہ گئی۔ احمد کی نظریں چھت پر پڑیں جو اتنی ہی دیر میں گیلی ہو چکی تھی چھت پر سایہ کئے ہوئے چنار کے پتوں سے پانی کے قطرے گرتے ہوئے صاف نظر آرہے تھے بوڑھا باپ براتیوں کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ احمد گھوڑی پر بیٹھا ہوا ایک بار پھر اپنے آپ کے ساتھ اُلجھتا چلا گیا۔ واپسی پر ہر کمرے میں بارش کا پانی جمع ہو چکا ہوگا کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ ہوگی۔ ماں نے جس کمرے میں دُلہن کے بیٹھنے اور پھر رات گزارنے کا انتظام کیا تھا وہ تھوڑی دیر بعد پانی میں ڈوب چکا ہوگا۔" باپ دھوکا کھا چکا ہے۔ اللہ کارساز ضرور ہے۔ لیکن چھت سڑ چکی ہے۔ اُس میں بڑے بڑے بے شمار سوراخ ہوں اور بارش ہورہی ہو۔ تو اللہ کیا کر سکتا ہے۔ گھوڑی پر بیٹھا ہوا احمد ایک بار پھر جزیرہ بن گیا......!!

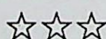
عین اس لمحے جب نکاح خوانی ہو رہی تھی کسی نے اندر آکر بتایا...... برف باری شروع ہو چکی ہے"۔

"ابھی تو گرما ہی ہے"۔

"اللہ کی مرضی"۔

"میں نے اپنے دادا سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ ہاڑ میں بھی برف باری ہوئی تھی"۔ گرتی ہوئی برف میں دُلہن ڈولی میں بٹھائی گئی۔ کسی نے سکوں سے بھری ہوئی ٹرے ہوا میں اُچھال دی۔ کوئی آواز نہ سنائی دی۔ برف باری کی وجہ سے ہنگامہ پہلے ہی سرد پڑ چکا تھا۔ براتی احمد کے گھر تک جانے کی بجائے راستے ہی میں کھسکنے لگے۔ گھر تک صرف چند قریبی رشتہ داروں نے ساتھ دیا۔ بوڑھی ماں نے اپنی بہو کو گلے سے لپٹایا۔ اس کے ماتھے کو چوما پھر اندر لے گئی، اس نے کانگڑیوں میں آگ ڈال کے رکھ دی تھی۔ اندر کمرے گرم تھے اور خشک تھے۔ احمد نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھا، چھت گیلی گیلی سی تھی، لیکن پانی بالکل نہیں ٹپک رہا تھا۔

دوسری صبح جب وہ باہر آیا تو برف باری تھم چکی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مکان کی چھت پر سایہ کئے ہوئے چنار پر لاکھوں سفید پھول کھل چکے ہیں۔ برف کے پھول، اور احمد نے اپنی جگہ سوچا۔ "اللہ واقعی بڑا کارساز ہے۔ اگر برف کی بجائے بارش ہوئی ہوتی تو سارے کمرے گیلے ہو چکے ہوتے۔ لیکن چنار کے پتوں نے برف کو چھت تک پہنچنے نہ دیا تھا۔



گمشدہ جنت

سفید گاؤں جو کبھی ''دنیا کی جنت'' کہلاتا تھا۔ اُجڑ چکا ہے اس کی ہری بھری وادیوں پر موت کی بھیانک پرچھائیاں رقص کر رہی ہیں۔

عبدالعزیز کا پھوڑا پک چکا ہے اس کے سینے کے ٹھیک وسط میں خون اور پیپ کا جوالامکھی اُبل رہا ہے۔ وہ بُری طرح تڑپ رہا ہے اس کا سارا جسم تپ رہا ہے۔ لیکن بے بسی کے عالم میں خاموشی کے ساتھ آنسو بہانے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ ہر طرف بھیانک اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

دور، سفید گاؤں کی حدوں کے اُس پار 'سُرخ گاؤں' میں عبدالعزیز کی بیماری پر سوچ بچار ہو رہا ہے۔ سُرخ گاؤں اور سفید گاؤں کے درمیان کوئی حد بندی نہیں۔ سُرخ گاؤں کے لوگ کسی بھی وقت بڑی آسانی کے ساتھ سفید گاؤں میں آجا سکتے ہیں اور عبدالعزیز کا علاج کر سکتے ہیں لیکن دشواری یہ ہے کہ علاج و معالجہ سے متعلق ان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہیں۔

ایک معالج کا خیال ہے کہ عبدالعزیز کے پھوڑے پر محبت، ہمدردی، خلوص اور رحم کا مرہم لگانا چاہئے جس سے نہ صرف غلاظت اور پیپ بہہ نکلے زخم بھی جلد بھر سکے پھر ایسی تدبیریں اختیار کی جانی چاہئیں کہ عبدالعزیز دوبارہ ایسی بیماری کا شکار نہ ہو۔

دوسرا معالج اس قسم کے علاج کو فضول اور بے سود تصور کرتا ہے اس کا کہنا

ہے آئے ہوئے اور بھیجے گئے بھیانک قسم کے جراثیم کی وجہ سے بُری طرح متاثر ہو چکا ہے اگر آج عبدالعزیز کا علاج رحم اور ہمدردی کا مرہم لگا کر کیا گیا تو کل اس کے جسم کے کسی اور حصّے پر یہ منحوس بیماری سر اُبھارے گی لہٰذا مرہم کے بجائے پھوڑے کو زبردست طاقت کے ذریعہ دبا دینا چاہئے اس صورت میں عبدالعزیز بے حد کمزور پڑ جائے گا اس کیساتھ ساتھ ''سبز گاؤں'' سے وارد ہونے والے بھیانک جراثیم پر مکمل روک لگا دینی چاہئے پھر جب عبدالعزیز کا جسم مہلک جراثیم سے پوری طرح محفوظ ہو جائے تو اُسے توانائی کے انجکشن لگائیں جائیں تا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کر سکیں۔

تیسرے معالج کا خیال ہے کہ عبدالعزیز کے روگ کا علاج صرف ''سبز گاؤں'' والوں کے پاس ہے۔ اسی لئے عبدالعزیز سبز گاؤں والوں کے حوالے کر دینا ہی بہتر ہے۔ وہ جانیں اور عبدالعزیز اس کی قسمت میں ہوگا تو اس کا روگ ٹھیک ہو جائے گا۔ چوتھا معالج اپنا علاج شروع کرنے سے پہلے ''سبز گاؤں'' والوں سے بے روک ٹوک بات چیت کرنے کے حق میں ہے وہ چاہتا ہے کہ سبز گاؤں والے اپنے سر پھرے جراثیم کو قابو میں رکھیں۔

سرحد کے اس پار ''سبز گاؤں'' والے بھی عبدالعزیز کی اس بھیانک بیماری سے پریشان ہیں۔ انہیں بھی عبدالعزیز کے دکھ کا احساس ہے۔ وہ دُہائیاں دے رہے ہیں...... ''ہم بے قصور ہیں۔ عبدالعزیز کی بیماری میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ ہم کسی بھی قسم کے جراثیم ''سفید گاؤں'' میں نہیں بھیج رہے ہیں۔ یہ سب ''سرُخ گاؤں'' کے لوگوں نے اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے سوانگ

رچا ہے۔ جب بھی ''سُرخ گاؤں'' میں کوئی بیماری پھیلتی ہے تو وہاں کے مکھیا اور نیتا سارا الزام سبز گاؤں کے سر تھوپتے ہیں، عبدالعزیز کے بھیانک روگ کی سب سے بڑی وجہ خود ''سرُخ گاؤں'' والوں کی لاپروائی ہے۔ ''سُرخ گاؤں'' نے ''سفید گاؤں'' کو اپنا غلام بنا رکھا ہے عبدالعزیز پچھلے ستاون برس سے ''سُرخ گاؤں'' والوں کے ظلم اور بربریت کا شکار ہوتا چلا آرہا ہے۔ ستاون برس سے اس کے سینے میں ''نفرت'' پیپ بن کر اس کے جسم میں جمع ہوتی چلی آرہی ہے۔ عبدالعزیز کی بیماری کا علاج ہمارے ہاتھ میں ہے۔ صرف سبز گاؤں کا معالج ہی اس کو صحت یاب کر سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود عبدالعزیز بھی یہی چاہتا ہے۔

رات لمبی ہوتی جارہی ہے کہیں کوئی تارا نظر نہیں آتا ''سُرخ گاؤں'' اور ''سبز گاؤں'' والے ایک دوسرے پر الزام تراشیوں میں مصروف ہیں۔ عبدالعزیز جھلس رہا ہے، نفرت کی آگ اس کے ریشے ریشے میں پھیل چکی ہے وہ معالجوں کے انتظار میں تھک چکا ہے لیکن وہ ''زندہ'' رہنا چاہتا ہے وہ اپنی ''ماں'' کے سینے سے لپٹ کر رونے لگتا ہے۔ آنسو بہا کر اسے راحت محسوس ہوتی ہے۔

تب وہ اپنی ''ماں'' سے کہتا ہے...... ''ماں مجھے ایک نشتر دلا دے۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پھوڑے پر نشتر چلا دوں گا اور اس مصیبت سے نجات حاصل کر لوں گا......''

اس کی ماں مسکراتی ہے اُسے یقین نہیں آتا کہ اس کا لختِ جگر اس قدر بہادر بن گیا ہے!!

☆☆☆

کسک

زین زینی زینب!

وہ زینب ہے ہاں وہ میری زین ہے۔ وہ امی جان کی زینی ہے وہ کلثوم کی زینب ہے۔

ہاں وہ زینب ہے!

وہی ہونٹ، بادام کے شگوفوں کی رنگت کے جو ہاڑے کے پتتے ہوئے دِنوں میں یاد آتے ہیں تو رُلاتے ہیں۔ ملایم گلابی، مخملی ...... ہونٹ ...... بادام کے شگوفے اتنے گلابی کہاں ہوتے ہیں؟ اسقدر مخملی کہاں ہوتے ہیں؟ اِسقدر ملایم کہاں ہوتے ہیں؟ اُن میں ایسی مہک اور مشام کہاں ہوتی ہے...... وہی نرگسی آنکھیں لیکن ایسی نرگیست نرگس کے پھولوں میں کہاں ہوتی؟ اور اخروٹ کی رنگت لمبے اُلجھے ہوئے بال جنھیں شروع بہار کے لطیف جھونکے مزید اُلجھا رہے ہوں گویا جنّت کے تمام دریچے وا کیے گئے ہوں۔ یہ ننھے ننھے سے قدم، جو میرے سینے پر چلتے ہیں۔ ہلکے ہلکے قدم گویا بہار کے بادلوں پر چل رہی ہو۔

لیکن زینب یوں کیسے چلتی تھی!

وہ تو! وہ تو!

اُس نے اپنے باپ کا ہاتھ چھڑالیا ہے...... وہ میری طرف آرہی ہے۔
اُس کی ماں حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ڈر ہے...... انجانا
خوف ہے۔

وہ میرے قریب آچکی ہے۔

میں ہڑبڑا جاتا ہوں۔ میں جلدی سے انگلیوں میں دبی ہوئی سلگتی ہوئی
سگریٹ ڈل کے پانی میں پھینک دیتا ہوں۔ وہی کیفیت...... دلنشیں خوف
کے لہراتے ہوئے گلابی سایے ذہن پر لہرانے لگتے ہیں جب زینب مجھے
سگریٹ سُلگاتی ہوئے دیکھتی تھی۔

''پاپا گندہ...... پاپا گندہ...... بڑی امّی پاپا......'' میں اُسکے ملائم گلابی مخملی
ہونٹوں پر ہاتھ رکھتا تھا۔! سوری بیٹا...... پلیز...... پلیز...... امّی سے کچھ نہ
کہنا...... وہ ناراض ہوتی ہیں۔ وہ مجھ سے بولنا چھوڑ دیتی ہیں...... دیکھو اگر
ہم آپ سے بولنا چھوڑ دیں تو......۔

''یہ پھر آپ سموک کیوں کرتے ہیں؟'' گلابی ملائم مخملی ہونٹوں پر تھر
تھراہٹ پیدا ہوئی۔

پھر میں نے عہد کیا تھا میں سگریٹ کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

وہ میرے بہت قریب آگئی ہے اور میں نے وہ سب سے بڑی قسم توڑ دی
ہے۔ میں نے نصف سگریٹ ڈل کے پانی میں پھینک دی ہے میں اپنے بازو
پھیلاتا ہوں......

میں جھیل ڈل کے کنارے صبح سے بیٹھا ہوں اب دس بج رہے ہیں میری

سگریٹ کی ڈبیاں خالی ہو چکی ہے...... یہاں سے ایک راستہ اندرون شہر کو جاتا ہے اور ایک راستہ نہرو پارک اور اُس سے آگے نشاط باغ کو اور اُس سے آگے شالیمار باغ کو۔ شروع بہار کے.....لطیف، ملایم امّی کے ہاتھوں میں ایسا لمس ہوا کرتا تھا۔!!

اُس کے پاپا اور امّی رُک جاتے ہیں اُن کے آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ہیں۔ لیکن اُس کے سنہرے بال میری بڑی ہوئی شیو سے مس ہوتے ہیں تو وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالکر آگے کا سفر ڈل کے کنارے کنارے شروع کرتے ہیں۔ اور میں اپنی پرانی کرم خوردہ غلیظ پشمینہ شال کا ایک حِصّہ اُسکے کندھے پر ڈالتا ہوں۔

''آپ روتے کیوں ہیں انکل......؟

میں اپنی بوجھل پلکوں پر اُس کے کومل گلابی ہاتھوں کا مخملی لَمس محسوس کرتا ہوں۔ ہو بہو.....زینب کے ہاتھوں کا لمس...... جب میری آنکھیں امّی کے روٹھ جانے پر بھیگ گئی تھیں۔

''اب بڑی امّی گھر واپس نہیں آئیں گی بیٹا۔!''

''کیوں نہیں......؟''

''وہ ہم سے روٹھ کر بہت بہت دور چلی گئی ہیں......وہ مجھ سے روٹھ کر چلی گئی ہیں......میں گندا پاپا ہون نا۔''

''اُن کے لئے چاکلیٹ کا ڈبہ لائیے۔ وہ ضرور واپس آجائیگی۔''

''نہیں بیٹا.....اب کوئی چاکلیٹ اُن کو گھر واپس نہیں لا سکے گی۔!''

''میری چاکلیٹ بھی نہیں۔؟''

''آپ کی چاکلیٹ بھی نہیں۔!''

اُس کی آنکھوں میں ایک سوال لہرایا...... ''کیا کوئی اتنا بھی گندا ہوتا ہے جو چاکلیٹ کے پرامس promise پر بھی گھر واپس نہیں آتا......!''

وہ ایک مرتبہ پھر مجھ سے کہتی ہے۔

''انکل......آپ روتے کیوں ہیں۔آپ تو اچھے انکل ہیں۔''

''نہیں بیٹا...... میں بہت گندا انکل ہوں۔''

''نہیں...... آپ مجھے اچھے لگتے ہیں...... لیکن آپ روئیے مت...... پلیز......''

''کہانی سنیں گی آپ......!''

''کِس کی کہانی......''

''ایک گڑیا کی......''

اُسکے ننھے ننھے ہاتھ بج اُٹھتے ہیں۔ ہماری بڑی امّی ہمیں بہت ساری کہانیاں سناتی ہیں۔ پریوں کی، شہزادوں کی، بلبلخ اور سفید دیوؤں کی، گڑیوں کی کہانی انھیں نہیں معلوم ...... آپ سُنائیے پلیز...... آپ کی گڑیا کی کہانی سُنائیں گے۔بے بی کی......جس کا نام......''

نہیں۔ہماری گڑیا رانی کی۔اُس کا نام زینب تھا...... بڑی امّی اُسے زینی کہہ کرپکارتی تھی اور کلثوم زینب یا زین!

''کون کلثوم''۔

''زین کی ممّی۔!''

''اوہ......''

زین...... زینی...... زینب...... وہ بالکل تمہاری طرح ہنستی تھی...... لیکن......وہ آپ کی طرح چل نہیں سکتی تھی۔''

''ژ......ژ......ژ...... بیچاری زینب......آپ نے اُسے دو بوند زندگی کے نہیں پلوائے تھے......''۔

''ہاں بیٹا...... یہی بات ہے۔ہم نے اُسے دو بوند زندگی کے نہیں پلوائے تھے۔''

''کیوں......نہیں......!!'' غصہ کرتے وقت اُس کے ہونٹ تھر تھراتے تھے۔

''جس دن دو بوند زندگی کے پلوائے تھے ہم اُس دن بہت خوش تھے، اُس کا تیسرا Happy Birth day تھا۔''

''ونڈر فل۔آج میرا چوتھا برتھ ڈے ہے۔''

''آج۔!!''

''ہاں۔! ارے آپ نے پھر رونا شروع کر دیا۔اب میں بھی رو پڑوں گی۔!!''

''نا بیٹا نا......آپ رونا نہیں......ہم نہیں روئیں گیں۔''

''پرومز''

''پرومز!۔اُس کا چوتھا برتھ ڈے تھا...... بہت بڑی پارٹی نہیں تھی۔زین

کے فرینڈز تھے۔ کچھ میرے تھے، اور کچھ زینی کی ممّی کے...... بس...... میں نے شام کو تین جگہ لکھ کے رکھا تھا...... دو بوند زندگی کے۔ ایک کچن میں، اور ایک ڈرائینگ روم میں...... تیسرا زینی کے بیگ پر...... لیکن...... لیکن امی کو ٹھیک اُس وقت اٹیک ہوا جب زین کیک کاٹ رہی تھی۔''

''ہاٹ اٹیک۔!''

''ہاں۔ آدمی بہت زیادہ خوش ہو تو اُسے بھی ہوتا ہے۔''

''کیوں؟''

میں نے جواب اُسی کے اندازِ میں دے دیا۔ یعنی اپنا نچلا ہونٹ باہر نکالا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔'' زین...... وہ مرگئی۔''

ہاں دو ہفتہ بعد اُسے بخار آ گیا...... اور وہ...... مرگئی...... نا بیٹا...... نا...... آپ اچھی بیٹی ہیں۔ آپ رونا نہیں آپ رونا نہیں...... میں......''

''آپ کیوں روتے ہیں۔''

میں نہیں جانتا بیٹا...... مجھے شاید زندگی بھر رونا ہے۔ روتے رہنا ہے۔ زین کی امّی کو بھی......''

''پھر تو آپ بھی گندے پاپا ہیں اور زین کی ممّی بھی گندی ممّا ہیں۔

میں اُسے بنڈ پر بٹھاتا ہوں پھر اپنی بھیگی آنکھیں کوہ ماراں کی طرف اُٹھاتا ہوں۔ پھر سفید گنبد سے میری نظریں آسمان میں کچھ تلاش کرتی ہیں۔ لیکن...... وہاں ہر طرف آسمان ہی آسمان ہے۔ نیلا، خاموش...... سناٹے کی اَن دیکھی لہروں میں ڈوبا ہوا مجھ سے میری زینب کو کیوں چھین لیا...... میں

تاریخ کا پروفیسر جو بھیانک سزا مجھے مِلی ہے تاریخ میں کسی باپ کو نہ ملی ہو۔!''

آسمان خاموش، ہری پربت کا قلعہ خاموش، کوہ ماراں ہ دامن خاموش ہے۔

ہم نہرو پارک کے گھاٹ پر پہونچ گئے ہیں۔

''زری......زرینہ......ہمیں پار پارک پر جانا ہے......بوٹ میں۔

میں اُسے سیڑھی پر رکھتا ہوں۔

اُس نے اپنے پاپا کی شہادت کی انگلی تھام رکھی ہے۔

ننّھے ننّھے قدم جیسے وہ بہار کے لطیف بادلوں پر چل رہی ہو۔

''خدا حافظ......بائی......''

وہ مُڑ کر مجھے دیکھتی ہے۔

اُس کی ممّی شکارے سے واپس اُترتی ہے......اپنے ہینڈ بیگ کا زِپ کھولتی ہے اور اُس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ لرز رہا ہے۔

''ہونہہ...... بھکاری...... "I say Begging should Be Banned"

وہ دس روپے کا نوٹ میرے اُس لرزتے ہوئے ہاتھ میں رکھتی ہے جیسے سے میں زری کو بائی بائی کہہ رہا ہوں۔



ریزہ ریزہ

آج مجھے کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ کہیں بھی نہیں جانا ہے۔ آرام ہی آرام ہے۔ یوسف میاں ایسا ہی کہہ رہے تھے۔ لیکن ابھی تو صبح کے صرف چھ بجے ہیں وہ دریا کے اس پار مرگھٹ سے دھواں اُٹھنے لگا ہے۔ دریا کے مٹیالے سینے پر کالے کوّے اپنی غذا تلاش کرنے لگے ہیں سٹرک کی صفائی کرنے والے دونوں خاکروب سنہری غبار میں غائب ہو گئے ہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں لگ گئے ہیں۔ نیچے کچن میں بریک فاسٹ تیار ہو رہا ہے۔ ہمارا خانساماں بھی کتنا فرض شناس ہے۔ وقت پہ آتا ہے۔ وقت پر ناشتہ تیار کرتا ہے۔ وقت پر لنچ لگا دیتا ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ کس طرح لذیز پکوان پکاتا ہے۔ گیس چولہوں کا تو یہی ایک فائدہ ہے۔ آواز نہیں، شور نہیں، دھواں نہیں۔ انسان نے کتنی ترقی کی ہے۔ سُنا ہے کہ اب امریکہ میں بٹن دبانے سے سب کام ہوتے ہیں۔ آپکو بھوک محسوس ہو رہی ہو تو مشین میں پیسہ ڈالئے، بٹن دبایئے اور کھٹاک سے آپ کی پسندیدہ ڈش آپ کے سامنے آجائیگی۔ پتہ نہیں وہاں بٹن دبانے سے انسان کی کون کونسی بھوک مٹتی ہے۔ انسان کی بھوکوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ لیکن امریکہ......۔

امریکہ کو دیکھنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی ہے۔ کتنا فرق ہے ہم میں اور

امریکیوں میں۔ امریکی ریٹائر ہو جاتے ہیں تو دنیا بھر کی سیاحت کے لئے نکل جاتے ہیں۔ ایک میں ہوں۔ ریٹائر ہوا ہوں لہٰذا مجھے اب کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ بس آرام سے بیٹھنا ہے۔ میرا بڑا لڑکا یوسف میرے لئے ڈھیر ساری کتابیں لے آیا ہے۔ ہر کتاب نئی ہے، خوبصورت سرورق، سفید چکنا کاغذ، ہزاروں صفحوں پر پھیلے ہوئے الفاظ۔ یہ ادیب بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ شاید ان کے دماغ بہت بڑے ٹیوبس کی طرح ہوتے ہیں۔ جتنا یہ دباتے ہیں اتنے ہی الفاظ نکلتے ہیں۔ یہ ٹیوب شاید کبھی خالی نہیں ہوتے۔ شاید انہیں دبانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی ہوگی۔ الفاظ خود بخود نکلتے ہونگے ...... میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ میں یہ فضول باتیں کیوں سوچنے لگا ہوں۔ مجھے آرام کرنا ہے۔ شاید میں بہت تھک چکا ہوں، میرے دماغ کا ٹیوب خالی ہو چکا ہے۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو خالی خالی محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے یوسف کا مشورہ مان لینا چاہئے، ایک کتاب شروع کرنی چاہئے۔ ہاں ...... یہ کارمارکس ٹھیک رہے گا، لیکن میں تو اس کو کئی بار پڑھ چکا ہوں اور صبح سویرے یہ فلسفہ ٹھیک نہیں رہے گا...... اخبار...... لیکن اخبار ہے کہاں ...... بہو...... بہو ارے کہاں ہو تم سب لوگ...... میں کب سے چلا رہا ہوں۔ بہو ہاتھ میں اخبار لئے میرے سامنے کھڑی ہے۔

''منّی کے ڈیڈی پڑھ رہے تھے''۔

وہ اخبار رکھ کر واپس چلی جاتی ہے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا جاتی ہے!!!

ابھی تھوڑی دیر قبل میں کتنی زور سے چلا رہا تھا۔ یہ مجھے نہ جانے کیا ہوا ہے۔ مجھے اس طرح چیخنا چلانا نہیں چاہئے۔

الیکشن، ہوائی حادثہ، قیمتیں، قتل، اغوا......!!

''دادا جی ناشتہ تیار ہے۔ سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں......''۔

''اچھا بیٹے......میں ابھی آتا ہوں۔ یہ خبر پڑھ لوں......''۔

میں اخبار کو ہاتھ میں لئے ہوئی نیچے اترتا ہوں۔ لیکن یہ کیا۔ یہاں تو سب لوگ ناشتہ کر چکے ہیں۔ یہ گڈو بھی جھوٹ بولنے لگا ہے اور یوسف وہ کہاں ہے......؟ کیا یہ لوگ میرا انتظار نہیں کر سکتے تھے، کیا میں اب اس گھر کیلئے اتنا غیر اہم بن گیا ہوں۔ یہ گھر جب کی ایک ایک اینٹ میں میرے خون کی لالی ہے۔ کیا اسی دن کے لئے میں نے خون پسینہ ایک کیا تھا۔ یہ میز کتنی گندی ہے۔ یہ کیتلی کس قدر ٹھنڈی ہے۔ نہیں شاید میرا ہاتھ ٹھنڈا ہے، نہیں کیتلی ہی ٹھنڈی ہے۔ بہو......بہو......ارے کہاں مر گئے تم سب لوگ۔ کیا تم دو منٹ کیلئے میرا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

''ابا حضور! ہم نے تو آپ کا آدھ گھنٹے تک انتظار کیا۔ گڈو کو چار مرتبہ بھیجا لیکن آپ تو اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔

ڈائننگ روم یک لخت خاموشی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ وقت خاموشی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ وقت کسی تیزی کے ساتھ بہہ رہا ہے اور میں ایک ہی مقام پر رُکا ہوں۔ جہاں سے شروع کیا تھا۔ وہیں اختتام بھی ہو چکا ہے۔

"لیجیے......نئی چائے بھگو کر لائی ہوں!......"

بہو کا لہجہ کس قدر اجنبی سا ہے...... غیر مانوس سا......کل تک تو نہ تھا نئی چائے بھگو کر لائی ہے تو کون سا احسان کیا ہے مجھ پر......اس کے یہ سب ٹھاٹھ باٹھ میرے وجہ سے ہیں۔اس کے شوہر کو میں نے بہترین تعلیم دلوائی، اچھے سکولوں میں داخل کرایا۔اس کے لئے اچھے ٹیوٹر مقرر کئے، اس کو صحت مند ماحول فراہم کیا۔ پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ میں نے اس کی نفسیاتی نشوونما کی طرف مکمل دھیان دیا......اور تب کہیں جا کر وہ آج بڑا آدمی بن گیا ہے اور یہ عورت مزے میں ہے۔ یہ چائے نہیں زہر ہے......کیا اسی دن کے لئے میں نے بے شمار خوبصورت دن اور بے شمار اجلی راتیں، ضائع کی تھیں......میں اب اس گھر میں ایک پل کے لئے بھی نہیں رہ سکتا......میرا بیٹا خود غرض ہے......میں آج اس کے لئے بوجھ بن گیا ہوں......

"دادا جی......یہ آپ چائے کی پیالی میں کیا تلاش کر رہے ہیں؟"

بوجھ......بوجھ......لیکن نہیں...... یوسف مجھے بوجھ نہیں سمجھتا۔ یہ عورت سمجھتی ہے، کتنی دیر سے یہاں اکیلا بیٹھا ہوں۔ ایک بھکاری کی مانند...... بھکاری......نہیں بھکاری شاندار کوٹھیوں میں کہاں رہتے ہیں...... میں بھکاری نہیں...... یہ شاندار کوٹھی میری ہے۔اس کی ہر چیز میری ہے۔اس گھر میں اب بھی میرا حکم چلتا ہے۔

"دادا جی......دوائی لینے کا وقت آ گیا ہے!"

ذیابیطس کا مارا جسم، مفلوج روح، خالی سینہ، کہیں کوئی پھانس ہے، کب نہ

تھی۔ مستقبل کتنا ڈراونا ہے۔ کیا اسی مستقبل کے لئے میں نے اپنی کمر دُہری کردی تھی...... وہ زمین کہاں ہے جس پر کھڑا ہو کر میں نے ایک لمبی اُڑان کے لئے پَر تول لئے تھے...... اُف میں کتنا اُڑ چکا ہوں...... اگر میں ریٹائر نہ ہوا ہوتا تو اُڑتا ہی چلا جاتا...... اُڑتا ہی چلا جاتا...... یہاں تک کہ میرے پنکھ ٹوٹ جاتے اور میں کسی اندھیرے سمندر میں گر جاتا۔

''دادا جی لنچ ٹائم......''

یہ وقت بھی کتنی جلدی بیت جاتا ہے۔ ہر چیز دسترس سے باہر رہ جاتی ہے۔ کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ یہ کھانا کس قدر بدمزہ ہے۔ نمک نہیں اس میں......نمک...... بائبل کہتی ہے کہ ہم زمین کے نمک ہیں لیکن مجھ میں نمک جیسی کوئی چیز نہیں۔ حلق تک رس گلے بھرے ہیں......کوئی کڑوی بے حد کڑوی چیز کھائے زمانہ بیت گیا ہے۔ اب صرف بہو کی کڑوی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ کاش کہیں سے مجھے ایک کچا سیب مل جاتا...... کچا......کھٹا......لیکن سب کچھ میری دسترس سے باہر ہے...... یہ اچار کی بوتل بھی...... یہ سلاد بھی......آج میں اچار کو چکھ بھی نہیں سکتا...... مجھے اتنی ہمت نہیں کہ بہو سے تھوڑا سا اچار مانگ لوں۔ شاید ساگ کا اچار ہے اور یہ سلاد۔ کچی پیاز۔ سرکے میں ڈوبی ہوئی اور یہ مولی کے قتلے۔ پودینے کی مہک......سب کچھ دسترس سے باہر ہے۔ میری چیک بک کہاں ہے۔ یہ لو......ایک ہزار روپے اور مجھے مولی کا ایک چھوٹا سا قتلہ دو...... یہ لو دو ہزار روپے اور مجھے پودینے کی مہک کا ایک جھونکا بخش دو......بہو سی سی بھی کرتی جارہی ہے اور انگلیاں بھی چاٹتی جارہی

ہے۔ اور میں اپنے سامنے بے بو، رنگ و بے حس سوپ کی پلیٹ میں صرف چمچہ ڈبو رہا ہوں۔ چمچہ چاندی کا ہے۔ سفید...... میری انگلیوں کی طرح...... نمک بھی تو سفید ہے...... مولی کے قتلے بھی تو سفید ہیں، اُف میرا دم گھٹ رہا ہے۔ یہ سوپ حلق سے نیچے اُترنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ میں اس ٹیبل پر تھوڑی دیر اور بیٹھا رہا تو پھر کبھی نہ اُٹھ سکوں گا، اس سے بہتر ہے کہ چھوٹی بہو کے ہاں چلا جاؤں۔ وہ کسی دفتر میں کام کرتی ہے...... دن بھر اس کی کڑوی باتیں سننے کو نہ ملا کریں گی۔ اسلم اکثر دورے پر رہتا ہے...... ہاں ٹھیک ہے۔ کھانا کھانے کے بعد جونہی بہو قیلولہ کرے گی میں چپکے سے نکل جاؤں گا...... رضی الدین...... ریٹائرڈ پرنسپل بے بس و مجبور...... اپنی مرضی سے اپنے گھر میں کچھ کھا نہیں سکتا...... سو نہیں سکتا...... بیٹھ نہیں سکتا...... جاگ نہیں سکتا...... اور اپنی مرضی سے اپنا گھر بھی نہیں چھوڑ سکتا...... ــ

سورج میں کتنی تمازت ہے...... یا شاید مجھے محسوس ہو رہی ہے۔ وہ ریڑھے والا بھی تو تپتی ہوئی سڑک پر ننگے پیر جا رہا ہے۔

''ارے پرنسپل صاحب آپ...... اس بھری دوپہر میں کہاں جا رہے ہیں......؟''

نوجوان پروفیسر کی آنکھوں میں سنہرے مستقبل کا خواب چمک رہا ہے۔

''راجباغ...... اسلم کے ہاں''۔

اسکوٹر پر بیٹھ کر ہوا کے لطیف جھونکے روح سے ٹکراتے ہیں۔

اسلم کی کوٹھی سنسان پڑی ہے۔ مالی سے پتہ چلتا ہے کہ مالکن شاپنگ کے

لئے گئی ہوئی ہیں۔ اس کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے...... انسان ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہوئے بھی کسی قدر دور ہے۔ چھوٹی بہو کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں...... نہیں شاید صرف میں بے خبر ہوں۔ یوسف اور اس کی بیوی جانتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ہی غیر ہوں...... نہ صرف غیر بلکہ غیر اہم بھی......!!

اب کہاں لے چلو گے مجھے رضی الدین کہیں سستا تو لو...... پل بھر کے لئے کہیں دم تو لو...... وہ دیکھو...... اس چنار کا سایہ کس قدر گھنا ہے۔ لیکن اگر کسی نے وہاں سستاتے دیکھا تو ...... ڈاکٹر یوسف اور ایگزیکٹو انجینئر کا باپ...... ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج ...... پارکوں میں پڑا رہتا ہے...... کون سا فرق پڑتا ہے...... نہیں نہیں بہت فرق پڑتا ہے۔ دُنیا میں اونچ نیچ کا خیال رکھنے والوں کو اپنی چاہتوں کا گلا گھوٹنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ ورنہ چناروں کے ہوتے ہوئے ائر کنڈیشنڈ کمروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو انسان جنگل نہ چھوڑتا...... یہ انسان جب سوتا ہے تو نہ جانے کیا ہوتا ہے...... وہ دور شاہ بلوط کے پیچھے نیلے آسمان کے بیچوں بیچ جو سفید بگلوں کی قطار اُڑتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں جا رہی ہے...... کاش میں ان بگلوں کی طرح اُڑ سکتا...... ہر انسان کے پاس اب صرف خواہشیں رہ گئی ہیں۔ اب وہ صرف اپنے خوابوں کے سہارے زندہ ہے...... ورنہ اسکے اندر اور باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے...... چھوٹی بہو کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے اور مجھے علم تک نہیں...... میں کتنا غیر اہم بن گیا

ہوں...... کیا میں اس سیب کے پیڑ پر چڑھ کر ایک سیب توڑ سکتا ہوں...... بھلا یہ کون سا مشکل کام ہے اور مجھے ڈرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مالی...... مجھے کسی مالی کا ڈر نہیں......اور ماں کا بھی نہیں......وہ قیلولہ کر رہی ہے......ارے ...... یہ لو میں تو پیڑ سے گر گیا ہوں...... ماں مجھے وہ پتنگ چاہئے۔ ڈیڈی دیکھئے تو آج میں کتنا خوبصورت ڈاک ٹکٹ لے آیا ہوں۔ نہ جانے امی میرے نہر میں تیرنے سے گھبراتی کیوں ہے......میں بچہ تھوڑے ہی ہوں کہ ڈوب جاؤں...... مجھے تو تیرنا بھی آتا ہے......نہر کا پانی کس قدر ٹھنڈا ہے۔ میں شام تک تیرتا رہوں گا، کل چھٹی ہے......ہوم ورک شام کو ہو جائے گا۔ کل پہلگام جانے کا پروگرام ہے...... ماں مجھے......ایک سیب دو......ڈیڈی...... ٹکٹ......سفید بگلوں کی قطار......میں اُڑ رہا ہوں......ڈیڈی......آ ہا ہا ہا...... اوں......اوں......ارے......اوں......سیب......"۔



لاپتہ

رات تاریک تھی اور سحر اس سے بھی زیادہ، سحر سے ذرا پہلے مغربی اُفق کو گھیرے سیاہ بادلوں نے ڈھک لیا تھا۔ لولاب کے دور افتادہ گاؤں عثمان آباد کے موذن محمد منور شاہ نے ماچس کو گھپ اندھیرے میں سمار سمار کر تلاش کیا اور دو روپے کی موم بتی روشن کی۔ مسجد زیادہ سے زیادہ دس قدم کے فاصلے پر واقع تھی۔ درمیان میں صرف دو جھونپڑ نما گھروندے تھے۔

موم بتی ہاتھ میں لے کر محمد منور نے کمرے کا جائزہ لیا۔ نسیمہ گٹھری بن کر کچھ سو رہی تھی کچھ جاگ رہی تھی۔ یہ اب اس کی عادت بن گئی تھی۔ یہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے یا صرف سوچ رہی ہے۔ شام کو بھی اندھیرا چھا جانے پر نہ وہ سوتی تھی نہ جاگتی تھی بلکہ بہت دیر تک پرانے چرخے کے پہیے سے سر لگا کر کچھ سوچتی تھی۔ شاید انور کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ جسے سرینگر میں راجباغ کے کسی بڑے افسر کے گھر میں ملازمت مل گئی تھی۔ چودہ برس کا محمد انور برتن مانجھتا تھا، غسل خانے صاف کرتا تھا...... سردیوں میں حمام میں لکڑی ڈالتا تھا۔ شام کو حمام صاف کرتا تھا۔ چھ ماہ کی بچی کو سنبھالتا تھا۔ بچی کی ماں بھی افسر تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے اپنے دفتر چلے جاتے۔ محمد انور ماں کی طرح بولتا کم

تھا۔ جب سینے پر ان دیکھے غم کا بوجھ ہوتو بولنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انور کی دو بہنیں تھیں، مریم اور زیتون۔ دونوں اس سے بڑی۔ مختصر سی دہلیز پار کر کے موذن محمد منور چھوٹے سے آنگن میں آ گیا۔ سامنے کچھ آہٹ سی ہوئی۔

کون؟" اس نے موم بتی کو ذرا اُونچا کرتے ہوئے کہا"۔

"شہ...... کریک ڈاؤن ہے۔ تم مولوی صاحب ہو"۔

"ہاں...... اذان کا وقت ہو رہا ہے"۔

"جاؤ اذان دو۔ مسجد میں بیٹھے رہنا۔ گاؤں کا جو آدمی نماز پڑھنے آئے گا اسے خبردار کرنا۔ میجر صاحب صبح آئے گا۔ خبر ملی ہے عثمان آباد میں دہشت گرد چھپے بیٹھے ہیں۔ میجر صاحب آئے گا تو سب مرد لوگ مسجد کے سامنے (کھالی) زمین پر لائن بنانا۔ میں بھی بیٹھا۔ گاؤں کے ہر شخص کا ریکاڈ ہے۔ آٹھویں جماعت سے آگے جتنے بھی لڑکے ہیں وہ بھی کریک ڈاؤن میں نکلیں گے"۔

موذن محمد منور کو بے ساختہ انور کی سیاہ آنکھیں اور سیاہ اُلجھے ہوئے بال یاد آئے۔ وہ بھی آٹھویں جماعت پاس تھا۔ اچھا ہے کہ محمد منور نے تین ماہ قبل لولاب کے تھانے میں اس کی ملازمت راجباغ میں اقامت پذیر ہونے...... سب کچھ صاف صاف لکھوایا تھا۔

غریب گاؤں، غریب لوگ...... لاؤڈ سپیکر لگوانے کی چاہت تو تھی طاقت نہیں۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر......

نمازیوں کی تعداد کم تھی۔ شاید کریک ڈاؤن کی سن گن مل گئی تھی۔ سردیوں میں اضافہ بھی ہوا تھا۔ اب جاڑا شروع ہونے والا ہے کسی بھی دن برف باری

ہوسکتی ہے۔

پھر جب سورج نے مشرقی پہاڑ کی گود سے کانپتے ہوئے سر اُبھارا تو محمد منور کو شدت کی سردی کا احساس ہوا۔ جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر پوس کی سرد ترین رات کو ٹھنڈے پانی کی دھار چھوڑ دی گئی۔

نو بجے میجر صاحب کی جیپ گاؤں میں داخل ہوئی۔ ساتھ میں دو جپسیاں تھیں ایک میں انفارمر تھا۔ اسے ہر شخص کی پہچان کرنا تھی۔ ہر شخص کو پہچان لیتا تھا۔ احاطے کے اختتام پر اس جیپ کو کھڑا کیا گیا۔ شناخت گر کی انگلی اُٹھانے کی بات تھی۔

"نہیں ہے"۔

"جانے دو"۔

"روکو......"۔

"شک ہے......"۔

مخبر کا چہرہ نقاب کے پیچھے ہے۔ قطار میں کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا رہے ہیں۔ مخبر ضرور بڑا شخص ہے۔ دہشت گرد پکڑا جائے یا مارا جائے۔ افسر کو ترقی ملتی ہے۔ مڈل ملتا ہے۔ انعام ملتا ہے اور دیش بھگت ہونے کی سند ملتی ہے۔ محمد منور شاہ...... ساٹھ برس کا ادھیڑ عمر کا آدمی، حفظ قرآن، مکڑی کو مارنا گناہ سمجھتا تھا۔ مکڑی کو دیکھتا تو آنکھوں کے سامنے ایک غار کی شبیہ اُبھرتی جس کے دہانے پر مکڑی نے راتوں رات اپنا جال بُن لیا تھا۔ وہ بھی قطار میں کھڑا تھا۔ جپسی کے سامنے پہنچا تو جپسی کے اندر بیٹھے

ہوئے نقاب پوش نے دو اشارے کئے۔

''جانے دو......''

''کچھ شک ہے''۔

محمد منور شاہ کو دائیں طرف اُن لوگوں میں بٹھایا گیا۔ جن کی تقدیر کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔

دس بجے سے چار اور مشتبہ لوگوں کے ساتھ پیش کیا گیا۔

میجر صاحب مہارشٹر کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔

مولوی صاحب......آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں''۔

''جناب......میجر صاحب......میری طبیعت کچھ خراب ہے۔ سر بھاری بھاری سا لگ رہا ہے''۔

وائرلیس مین کو بلایا گیا اسے ہدایت دی گئی کہ یونٹ کے ڈاکٹر کو آگاہ کرے۔

ڈاکٹر نے آنے میں دیر نہ لگائی۔ اس نے محمد منور کو دور بین لگائی۔ اس کا بلڈ پریشر چیک کیا۔

''بلڈ پریشر ہے۔ گھر جاؤ، یہ دوائی لو اور سو جاؤ''۔

لیکن اتنی دیر میں محمد منور کی حالت غیر ہونے لگی۔ قدم اُٹھانے کی سکت باقی نہ رہی۔

وہ زمین پر ہی لیٹ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اُجلے اُجلے، کالے کالے بادل جیسے کاغذ لہرانے لگے۔

پھر انور کا وہ خط یاد آیا جو اس نے علی محمد فارسٹ گارڈ کے ہاتھ بھیج دیا تھا۔

''میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ آپ سب لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ امی جان زیادہ یاد آتی ہیں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہے۔ بیگم صاحبہ بہت خیال رکھتی ہیں۔ انہوں نے تانبے کی برتن قسطوں پر دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔ چولہے سے لکڑی کے دو ٹکڑے ڈالنے سے پانی گرم ہوتا ہے۔ مریم اور زیتون ہر وقت سر کو کھرچتی رہتی ہیں۔ اب انہیں سر دھونے کے لئے گرم پانی ملا کرے گا۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ سردیوں میں ٹھنڈے پانی کے استعمال سے ان کا سینہ کمزور پڑ گیا ہے۔ اسلئے اکثر خراب رہنے لگا ہے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔ آپ کا فرمانبردار بیٹا۔ محمد انور شاہ''۔

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر''۔

دفعتاً گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔

''کیچ ہِم، پکڑو بھاگنے نہ پائے''۔

ایک نوجوان آدمی بے تحاشہ مسجد کی طرف دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے وہ فرش پر لیٹے محمد منور سے ٹکرایا اور گر پڑا۔

''مولوی، میجر دہاڑا۔'' وہ تم سے ٹکرایا تھا۔ تم اسے دبوچ سکتے تھے، وہ تمہارا جوڑی دار تھا''۔

''میجر صاحب میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، کہاں

چلا گیا"۔

"میں کچھ بھی نہیں جانتا"۔

"تمہیں سب کچھ پتہ ہے، تم سب کچھ چھپا رہے ہو"۔

فوجی کیمپ میں چھ روز تک متواتر اس سے پوچھ گچھ کی گئی۔ ایک پارٹی آتی تھی، دوسری جاتی تھی۔ عجیب قسم کے سوالات پوچھے جاتے۔

"تمہارے لئے پیغام لے کر کون آتا ہے"۔

"پیسہ لے کر کون آتا ہے۔ کب آئے گا"۔

"گولہ بارود کب آئے گا، کہاں آئے گا"۔

"سب لوگوں کے نام بتاؤ۔ تمہیں انعام ملے گا۔ بہت بڑا انعام ملے گا۔ تم اپنا بڑا گھر بنا سکو گے۔ اس گھر میں بڑا سا غسل خانہ ہوگا۔ جس میں بجلی پر چلنے والا گیزر ہوگا۔ بس بٹن دباؤ اور پندرہ منٹ میں پانی گرم"۔

"میں کچھ بھی نہیں جانتا، مجھے کچھ بھی نہیں معلوم"۔

اسے چھ روز بعد بارہمولہ فوجی کیمپ میں پہنچا دیا۔ پھر وہی سوالات دہرائے گئے۔ پھر ایک دن ایک تھیلی میں زندہ چوہے لائے گئے۔ اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ ٹھنڈے پسینے کی دھار ریڑھ کی ہڈی کو چیرتی ہوئی گذر گئی اور اس کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکل گئی۔ دس منٹ تک خوفناک بھوکے تشدد پر آمادہ چوہے اس کے چہرے کو کاٹتے رہے۔

پھر وہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ محمد انور کو بھول گیا۔ وہ نسیمہ اور اس کے پرانے چرخے کو بھی بھول گیا۔ وہ مریم اور زیتون کو بھی بھول گیا۔

پھر ایک دن اسے پولیس گاڑھی میں بٹھا دیا گیا جس نے اسے عثمان آباد پہنچا دیا۔

مغرب کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ اب عثمان آباد کی مسجد میں لاوڈ اسپیکر بھی لگوائے گئے تھے۔

اسے اتنا یاد تھا کہ مغرب کی نماز پر تین رکعت فرض کی پڑھنی ہیں۔ وہ نمازیوں میں سے کسی کو بھی نہ پہچان سکا۔ نہ کسی نے اسے پہچانا۔ دس قدم کے فاصے پر اس کا گھر تھا۔ نسیمہ، نسیمہ کا چرخہ ...... چرخہ کی گھوں گھوں...... زیتون......مریم۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

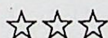
دروازے پر ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی جس کی گود میں تین سالہ بچہ تھا۔

بیٹی ...... یہ گھر...... میں......موذن۔

ہلکی، ہلکی برف باری شروع ہوئی۔

برف کے گالے لہرا کے گرتے رہے۔

اس کی داڑھی کے بال بھیگتے رہے۔



کھیل

ایک زوردار چھناکہ ہوا......

چھکّا اُڑانے کی کوشش میں بلّا بڑی تیزی کے ساتھ گھمایا گیا تھا۔ گیند بلّے کے عین بیچ میں آلگی تھی اور پھر اُونچے سفیدوں کے بیچ میں سے تیرتی ہوئی آصف وِلا کے ڈرائینگ روم کے ایک روشندان کے شیشے کو توڑتی ہوئی اندر دبیز قالین پر لڑھک کر رہ گئی تھی۔

چھکّا لگانے والا وہی بد بخت نیلی آنکھوں والا، رحمت علی پان فروش کا لونڈا، یاور تھا، اس سے پہلے وہ آصف وِلا کے بارہ شیشے توڑ چکا تھا۔

کھلاڑیوں کو آناً فاناً چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ مالی، خانساماں، ڈرائیور، چوکیدار اور خود آصف خان، آڑھا ترچھا بلّا، اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور نیلی آنکھوں میں مایوسی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا جیسے کسی بلّے باز کو ننانوے کے سکور پر امپائر نے شک کی بنا پر آوٹ قرار دیا ہو۔

چوکیدار اور مالی کچھ زایدہ ہی حق نمک ادا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

''شیشہ معمولی چیز ہے دوبارہ لگ سکتا ہے لیکن اگر ڈائنگ روم میں کوئی بیٹھا ہوتا تو......''

چوکیدار نے دو چار انتہائی نفیس قسم کی گالیاں دیکر کہا: ''تمہیں کرکٹ کھیلنے

کا اتنا ہی شوق ہے تو کہیں اور جا کر کیوں نہیں مرتے'' یہ سڑک تمہارے باپ کی ہے کیا! تم ہی ان سب، اپنی بہن کے شوہروں کو یہاں آنے کیلئے اُکساتے ہو۔ بارہ شیشے توڑ چکے ہو اب تک''۔

کھلاڑی پٹتے رہے، یاور کچھ زیادہ ہی پٹ رہا تھا، مالی کا ایک بھرپور ہاتھ چہرے پر اس طرح پڑ گیا تھا۔ کہ انگلیوں کے نشان بیچ میں لگی وکٹوں کی طرح صاف نظر آ رہے تھے۔ پھر تمام کھلاڑیوں کے ماں باپ بلوائے گئے۔ مالی اور چوکیدار نے جو کسر باقی چھوڑ دی تھی وہ رحمت علی نے خود پوری کر دی۔ بستی والوں نے ایک ایک کر کے آصف صاحب سے معافی مانگ لی۔ آصف صاحب کو یقین دلایا کہ ان کے بچے اب سڑک پر کبھی بھی کرکٹ نہ کھلیں گے تب کہیں جا کر آصف صاحب سرد پڑ گئے ورنہ انہوں نے پولیس اسٹیشن کے نمبر بھی گھمانے شروع کئے تھے۔

ڈرائنگ روم کا شیشہ شام ہونے سے پہلے ہی بدل دیا گیا۔ کل پہلی فلائٹ سے جاوید آٹھ سال بعد گھر لوٹ رہا تھا۔

جاوید کرکٹ کا اچھا کھلاڑی تھا۔ میڈیکل کالج میں اسی بناء پر داخلہ ملا تھا لیکن ڈاکٹر بننے کے بعد کرکٹ کے ساتھ اس کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ اس دن آصف صاحب بڑے خوش تھے۔ بالکونی میں مسز آصف کے ساتھ بیٹھے مختلف جگہوں سے آئے ہوئے رشتوں کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ مسز آصف اپنی چھوٹی بہن کی بیٹی کو بہو بنا کر گھر لے آنا چاہتی تھی۔ آصف صاحب اپنے بچپن کے دوست ڈاکٹر کمال کی بیٹی کے حق میں تھے''!!

''میں امریکہ جارہاہوں......!!''

جاوید کا اعلان دونوں نے خاموشی سے سن لیا۔ خوش آئند دور کی سوچوں کے سلسلے یک بیک رک گئے۔

منوج نے یہ خبرسنی تو دوڑا دوڑا آصف ولا چلا آیا۔ جاوید اور اسکی دوستی سینما ہالوں اور قہوہ خانوں کے بجائے کرکٹ کے میدانوں اور کتب خانوں میں پروان چڑھی تھی۔ للہذا اس میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ ایک سوجھ بوجھ تھی، جاوید ایک اچھا بلے باز تھا تو منوج ایک ماہر لیگ سپنر۔ اس کی گیندیں بلی بازوں کو اس طرح چکمہ دیتی تھیں کہ بلے باز امپائر کی اوپر کو اٹھی ہوئی انگلی کو دیکھ کر رہ جاتے۔

''کیا یہ سچ ہے''۔

''ہاں......''۔

''لیکن کیوں؟''

''میرے پاس تمہارے اس سوال کا کوئی جواب نہیں......''۔

''یہاں کس بات کی کمی ہے۔ پاپا کا وسیع پھیلا ہوا کاروبار، نوکر چاکر، زندگی کی ہر آسائش میسر ہے۔'' کیا رکھا ہے یہاں! دنگے فساد، کرپشن، ہپوکریسی، لوٹ کھسوٹ، مذہب، زبان، کلچر، سکینڈل پر سکینڈل بھانت بھانت کی بولیاں اور ان سب کے اوپر زندگی کے سنہری اصول نفرت ہے۔ مجھے اس نظام سے اس دوغلے پن سے۔ میں بہاؤ کیساتھ بہنا نہیں چاہتا اور نہ مجھے یہ سب کچھ گوارہ ہوگا''۔

''لیکن یہی تو زندگی کا کھیل ......ہم سب کھلاڑی ہیں۔ ہمیں اچھے کھلاڑیوں کی طرح اپنا کھیل کھیلنا ہوگا، ہار جیت تو معمولی بات ہے......''۔

''ہار جیت، کامیابی، ناکامی، یہاں کامیاب وہ ہے جس کا بنک بیلنس بڑا ہو، ایک عالیشان مکان ہو ایک وفا پرست بیوی، ذہین اور قابل بچے ہوں......اور اسکے بعد بڑھاپا اور پھر آوٹ......لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں، کولہو کا بیل بن کر مجھے جینا پسند نہیں۔ میں زندگی بھر ایک عورت کا غلام بن کر جینا نہیں چاہتا، جس طرح پاپا اور تمہارے ڈیڈی پچھلے تیس برس سے جیتے چلے آرہے ہیں۔ زندگی کا کھیل اور زندگی کا حسن کچھ اور ہی ہے''۔

''زندگی ایک کھیل کے سوا اور کچھ نہیں، کچھ لوگ صاف ستھرا کھیل کھیلتے ہیں۔ ہار جیت سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہار جیت سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ جینے کے لئے کچھ بھی کرتے ہیں۔ زندگی کا یہ دستور ازل سے چلا آرہا اور اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی......اور پھر تمہارے امریکہ میں ہے کیا؟ عریانیت، بے ہودگی، فحش نگاری۔

جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک سگریٹ سلگا کر کچھ عجیب سی نظروں سے منوج کو دیکھنے لگا۔ چھ ماہ تک جاوید کے خط متواتر ملتے رہے، پھر خطوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ پھر فون بھی کم آنے لگے۔ آصف ولا میں آٹھ بڑے بڑے کمرے تھے، خالی، خاموش، ویران۔ پھر ان میں دو کمروں کا اضافہ ہوا۔ وہ بھی خالی، خاموش اور ویران۔ میاں بیوی آپس میں بہت کم بولنے لگے۔ بولتے بولتے اُنہیں رونا پڑتا تھا۔ آصف صاحب کو سب کچھ برداشت تھا

لیکن مسز آصف کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے لیکن آٹھ برس...... آٹھ برس بہت ہوتے ہیں۔ ایسا خود بخود ہوا، وہ ایک دوسرے کے سامنے اب بہت کم بولتے تھے۔ آصف ولا کے سامنے پھیلے ہوئے کشادہ اور وسیع باغ کی روشیں مالی کی ہزار کوششوں پر بھی انہیں اُجڑی اُجڑی نظر آتی تھی۔ ان میں لگے ہوئے پھولوں کے رنگ پھیکے لگتے تھے۔ شاید جوان اکلوتے بیٹے کے بدن کی خوشبو کچھ اس طرح حواس پر چھائی ہوئی تھی کہ گلابوں کی مہک سے ان کی لاتعلقی مقدر بنتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنا دکھ اور افسردگی چھپانے کی پوری کوشش کرتے۔

پھر ایک دن انہیں وہ نظر آیا۔ اس کی بھی آنکھیں نیلی سی تھیں۔ اس کے کرکٹ کھیلنے کا انداز بے حد خوبصورت تھا۔ بالکل جاوید کی طرح بلا گھماتا اور چھکے پر چھکا لگاتا تھا۔ آصف ولا کے پچھواڑے میں پارکنگ کیلئے ایک کشادہ جگہ تھی۔ سڑک کے اس پار کچی بستی کے لڑکے اکثر جمع ہوتے تھے۔ چار بجتے بجتے کھلاڑی میدان میں اُترنا شروع کرتے۔ آصف صاحب بالکونی میں آ کر بیٹھ جاتے۔ پلاسٹک کی گیند سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا لیکن بعض اوقات وہ ربڑ یا فوم کی ذرا بھاری گیند بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ گیندیں بھی نقصان دہ نہیں تھیں۔ لیکن چھکّے اُڑانے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ خاص طور سے وہ نیلی آنکھوں والا یاور، رحمت علی پان فروش کا لڑکا، بالکل جاوید کی طرح بلّا گھماتا تھا۔ آصف وِلا کا ڈرائنگ روم اسی پارکنگ کی جگہ کی طرف واقع تھا۔

چھکّے لگتے رہے۔ شیشے ٹوٹتے رہے۔ ہر ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیں صاف کرتے کرتے آصف صاحب اپنے آپ کو ہلکا ہلکا محسوس کرتے۔ اور مسز آصف کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی۔

پھر ایک دن جاوید نے یکا یک فون پر گھر آنے کی اطلاع دی! اور یکا یک مسز آصف کی نظریں کھڑکیوں کے پردوں پر پڑی۔ نجانے کیوں ان کا رنگ پھیکا پھیکا سا نظر آنے لگا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے بھی پُرانے نظر آنے لگے۔ دیواروں کا روغن بھی بھدّا دکھنے لگا اور ڈرائنگ روم کے بغل کا شور وغل کانوں کو بُری طرح کھٹکنے لگا۔

ایک زوردار چھنا کہ ہوا اور آصف صاحب گرجنے لگے۔ مالی، ڈرائیور، چوکیدار، گھیر لو ان حرام زادوں کو، انہوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ شام ہونے سے پہلے ہی ڈرائنگ روم کے پردے اور صوفے بدل دیئے گئے اور نیا شیشہ بھی لگوایا گیا اور اعلان کر دیا گیا کل سے میچ نہیں ہوگا۔

جاوید طویل دعاؤں اور لمبے سجدوں کا ثمرہ، نیلی آنکھوں کی چمک پچھلے پہر کے چاند کی طرح ماند پڑ گئی تھی۔ لمبے، گھنے، سیاہ بال ایک اُجڑے ہوئے ویران کھیت کی طرح خالی خالی ہونٹوں پر ایک غمزدہ مسکراہٹ جیسے کسی بلے باز کو ننانوے کے سکور پر امپائر نے شک کی بناء پر آوٹ قرار دیا۔ رات کو کھانے کی ٹیبل پر جاوید نے کہا کہ وہ کل صبح واپس جا رہا ہے۔ راجدھانی میں ایک ضروری سمینار میں شرکت کرنی ہے!!

اُمیدوں کے کنول مرجھا جانے میں اور آرزوؤں کے چراغ بجھنے میں

وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ وقت کوئی مہربان پری نہیں جو دل پر چھائی ہوئی دھند اور روح پر چھائے ہوئے بوجھ کو اپنی جادو کی چھڑی سے ہٹادے۔ یہ تنہائی کے دن اور خموشیوں کی راتیں ہمارے ہی لئے کیوں بنائی گئیں ہیں۔ کیا ہماری محبت میں کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی۔

آصف صاحب کروٹ پہ کروٹ بدل رہے تھے۔ انھوں نے بتّی جلا کر وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔ انہوں نے مسز آصف پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالیں۔ انہیں ایسا لگا کہ جیسے وہ نہ سو رہی ہوں نہ جاگ رہی ہوں۔ انہوں نے گاؤن پہنا اور پھر جاوید کے بیڈ روم کی طرف قدم بڑھائے! جاوید ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ بے سدھ، اٹیچی کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ انہوں نے جاوید کا بریف کیس کھولا۔

''آوٹ'' دفعتاً شور بلند ہوا، وہ ایک پٹے ہوئے کھلاڑی کی طرح ڈھیلے پڑ گئے، ''ایچ۔ آئی۔ وی۔ پازیٹو!!''

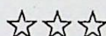
دوسری صبح کی پہلی فلائٹ کا کیا وقت رہا، آصف صاحب یا مسز آصف نے اس میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی۔ آصف ولا کے آٹھ بڑے بڑے خالی، اداس اور ویران کمروں میں ایک مرتبہ پھر دو خالی خالی سے کمروں کا اضافہ ہوا۔ گلابوں کی مہک سے لاتعلقی ایک مرتبہ پھر مقدر بن گئی۔ پھر دونوں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ میدان خاموش تھا، کہیں کوئی کھلاڑی نظر نہیں آرہا تھا، پھر عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ آصف جاءنماز بچھانے لگیں۔ آصف صاحب نے ایک پُرانے نوکر کو آواز دی۔

”جی مالک“

”وہ جاوید کی سٹڈی کی چابی......“

سٹڈی کتابوں اور فائلوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک ریک پر کرکٹ کھیلنے کا بہت سارا سامان پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک خوبصورت سا بلا اُٹھایا۔ اس پر گرد کی ایک ہلکی سی تہہ جمع ہوگئی تھی۔ ایک کپڑے سے اسے صاف کیا اور باہر جانے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر رُک گئے پھر واپس مڑے ایک چمکتی ہوئی گیند کو بھی اُٹھایا پھر باہر آگئے۔

تھوڑی دیر بعد ان کے قدم سڑک کے اُس پار کچّی بستی کی طرف اُٹھ رہے تھے۔



نوحہ

سکینہ کو ایسا لگا جیسے اُس کا دل حلق میں آ کر اٹک گیا ہو۔ پیٹ میں ہزاروں سڑی ہوئی مچھلیاں اُچھل رہی ہوں۔ اور سر کے اندر، روح کے کسی گوشے میں ہزاروں ٹریکٹر چل رہے ہوں۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں ہوا تھا۔

ابھی...... بس ایک سیکنڈ پہلے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ ایک ایسے پوچھے گئے سوال کا جواب لکھ رہی تھی جس کی تیاری میں، اس نے اور پاپا نے دِن رات ایک کئے ہوئے تھے۔ بیالوجی کے اِس پرچے میں سوالات کی کل تعداد نو تھی جس میں سے صرف پانچ کے جواب لکھنے تھے۔ اُس نے بڑی آسانی کے ساتھ پانچ سوال چن لئے جن کے جواب اس نے پاپا کے ساتھ مل کر تیار کئے تھے۔ پاپا چند اچھی، میعاری اور تازہ ترین ریفرنس کتابیں بازار سے خرید کر لائے تھے۔ وہ خود بھی بیالوجی کے مانے ہوئے پروفیسروں میں شمار ہوتے تھے۔ اور باپ بیٹی نے تازہ ترین حوالوں اور مثالوں کے ذریعے اچھے اور میعاری نوٹس تیار کئے تھے۔ سکینہ نے امتحانی مرکز میں قدم رکھتے ہی اللہ کو یاد کیا تھا۔ ماں کی ہدایات کے مطابق پیارے نبیؐ پر دس مرتبہ درود شریف اور سلام بھیجا تھا۔ بسم اللہ کہہ کر بیالوجی کا پرچہ ہاتھ میں لیا تھا۔

یہ پُر مسرت ساعتیں، دل کا بوجھ ہلکا کرنے والے لمحے بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔

''اے لڑکی! ایک نہایت سخت آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ اور اس نے جب نظر اُٹھا کر دیکھا تو دو خشم ناک آنکھیں اُس پر اٹی ہوئی تھیں۔ امتحانی سینٹر پر چھاپہ ڈالا گیا تھا۔ لمبے قد والا سوٹ ٹائی پہنے جو شاید چھاپہ مار دستے کا سر براہ تھا، اس کے قریب آیا اور گہری نظروں سے اس کی کانپتی ہوئی پلکوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگا۔ روح کو منجمد کرنے والی سائیں سائیں کرتی ہوئی خزاں کی ٹھنڈی ہوا اس کے روم روم کو جھنجوڑنے لگی۔

''پولیس...... اس کی تلاشی لی جائے......! اُس نے دروازے پر کھڑے ایک پولیس کانسٹیبل سے کہا''

''لیڈی پولیس......''

پلک جھپکنے میں زنانہ پولیس کی دو خواتین دروازے پر نمودار ہوئیں۔ ایک سب انسپکٹر تھی اور دوسری کانسٹیبل۔

سب انسپکٹر چالیس پینتالیس کی حدود میں تھی۔ خرانٹ، لھرا لھرا سا چہرہ جس پر بُری طریقے سے لیپ پوت کی گئی تھی۔ آنکھوں میں سرمے کی موٹی موٹی لکیریں۔ وہ سکینہ کو اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے نیم تاریک کمرے میں لے گئی...... اس نے پہلے سکینہ کو اوپر سے نیچے تک ٹٹولا اور پھر اچانک اسکے گریباں کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ اور سارے سینے پر اُس کا ہاتھ رینگنے لگا اور سکینہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی تلاشی نہیں بلکہ سینے کی گولائیں ماپنے کے

لئے کیا گیا ہو۔ سکینہ کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''میڈیم میرے پاس کوئی نقل نہیں......'' وہ لڑکھڑائی ہوئی زبان سے بولی۔ سب انسپکٹر کا ہاتھ اب بغلوں تک پہنچ گیا تھا۔

''پاپا...... یہ کیا ہو رہا ہے۔ اللہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں......''۔

''وہ......ایسے دباتا ہے......!'' سب انسپکٹر لیس کے ہونٹوں پر ایک کمینی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ سکینہ کا چہرہ فق ہو رہا تھا، اس کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا جب پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک کسی امتحان کے موقعہ پر اس طرح اُس کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اٹھارہ برس، میدی جیسی رنگت، گہری سیاہ آنکھیں......حیا کا نور، محض اٹھارہ برس کی عمر میں زندگی کا کوئی گہرا فلسفہ، کوئی بندھا ٹکا نظریہ، کوئی مضبوط نکتہ نگاہ نہیں ہوتا۔ صرف خواب ہوتے ہیں صرف دل کا بھروسہ ہوتا ہے۔ سیدھا سادا سا، لیکن پہاڑوں جیسا مضبوط، سمندر جیسا گہرا، سورج جیسا روشن، گلاب جیسا شگفتہ، بادام کے شگوفوں جیسا کومل، جو ڈھکا بھی ہوتا ہے اور عیاں بھی۔ ماں کی دعائیں، لمبے سجدے، پاپا کا بے لوث پیار......

سکینہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگ جائے، اپنے پاپا کے پاس۔ اپنی امّی کے پاس، لیکن ابھی وہ پہلے طور سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ ایک اور جھٹکا لگا۔

''ایزار بند کھولو......!''

''میڈیم میں سچ کہتی ہوں......میں......میرے پاس کوئی نقل نہیں، میں

پاپا کی قسم''۔

''پاپا کی بچی، چل جلدی کر......''۔

''میں......''

''سر جی...... یہ تلاشی لینے نہیں دیتی......''۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔ نقل اس نے کہیں چھپا کے رکھا ہے، اس جیسی آوارہ لڑکیوں نے ہمارے سسٹم کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ سال بھر پڑھتی نہیں...... محنت نہیں کرتیں اور امتحان کے وقت نقل کرتی ہیں، زبردستی اس کی تلاشی لو......''۔

''اے لڑکی، تو تلاشی لینے دیتی ہے یا نہیں......''۔

''دیکھیئے میڈیم...... خدا کی قسم......''۔

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک جھٹکے میں ایذار بند کو کھینچا۔ سکینہ کے منہ سے ایک ایسی کربناک چیخ نکل گئی جیسے ایک تیز دھارے والے چاقو سے اُسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ سب انسپکٹریس نے اپنا ہاتھ انڈر وئیر کے اندر ڈالا۔ سکینہ بید لرزاں کی طرح لرزنے لگی۔ اِسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بھرے بازار میں الف ننگا کر دیا گیا ہو اور ہزاروں لاکھوں آنکھیں ناگ بن کر اُسے ڈس رہی ہوں۔ اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ کسی پر کٹے پرندے کی مانند حلق کی رگیں تن گئیں۔ ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرتے ہوئے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا جیسے بحر ظلمات کے سارے کنارے ٹوٹ گئے ہوں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا

گیا...... پھراس کا ہاتھ کیسے اُٹھااور کس طرح سب انسپکٹرلیس کے چہرے پر ایک زناٹے دار طمانچے کی صورت میں پڑا۔ اُسے اس بات کا پتہ بھی نہ چلا ...... پھر دوسرا تھپڑ...... پھر انسپکٹرلیس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... ـــ

تت......تم نے مجھ پر ہاتھ اُٹھایا......ایک نہیں، دونہیں، تین تھپڑ......ایک پولیس اہلکار پر......حرام زادی، کتیا، میں تجھے زندہ نہ چھوڑوں گی......چل تھانے......ذلیل کتیا، ایک نقل کررہی تھی اوپر سے مجھ پر ہاتھ اُٹھایا...... ـــ

اس سے اس کا جوابی پرچہ چھین لیا گیا۔ اس کے پرچے پر ایک لمبا چوڑا نوٹ لکھا گیا۔ وہ ہر لفظ کے ساتھ ٹوٹتی رہی، بکھرتی رہی۔ ریزہ ریزہ ہوتی رہی۔ سال بھر کی کڑی محنت اور مشقت کا یہ صلہ۔

اُسے ایک پولیس جیپ مین بٹھایا گیا۔ حوالات کے نیم تاریک کمرے میں ایک خوفزدہ ابابیل کی طرح ایک کونے میں دُبک کر بیٹھ گئی۔ سلاخوں کے دوسری طرف سپاہی، آفیسر اور قیدی بار بار دیکھنے آتے تھے۔

پاپا کو فون کیا گیا......وہ بدحواسی کے عالم میں دوڑے چلے آئے...... ـــ

''پروفیسر اکرم...... مجھے آپ کو پروفیسر کہتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ آپ استاد نہیں ایک گرے ہوئے، خودغرض اور انتہائی قسم کے ٹیچر ہیں۔ یہی تعلیم دے رہے ہیں آپ ہمارے بچّوں کو، یہی سب سکھا رہے انہیں۔ آپ کی صاجبزادی تین سال تک کسی بھی امتحان میں بیٹھ نہیں سکتی......اور اس کے خلاف ایک ایف آئی آر بھی درج ہے۔ اس نے ایک خاتون پولیس آفیسر پر

ہاتھ اُٹھایا ہے"۔

ڈی، ایس، پی نہایت غصّے میں تھے......!!

پروفیسر اکرم کا سر نہ جانے کیوں جھکتا چلا گیا۔ آنکھوں میں نمی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ بس ہونٹوں پر ایک تھرتھراہٹ سی تھی۔ انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ضمانت کے کاغذات پُر کیئے۔

سکینہ کو سارے لوگ، سارے مکان، ساری گاڑیاں نظر آرہی تھیں، لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سڑک پر، زمین پر، آسمان پر وہی گہرا سناٹا مسلط تھا۔

ماں بیٹی بہت دیر تک مَل مَل کر روتی رہیں۔ گھر میں آج چولہا نہیں جلا۔ سناٹا بڑھتا رہا۔ اُس نے اپنی سٹڈی کی ساری کھڑکیاں بند کیں۔ دروازے کو بھی اندر سے بند کیا۔ پھر ایک ایک کر کے تمام کتابوں کا، نوٹس کا، کاغذات کا ڈھیر لگا دیا۔ سب کے اوپر بیالوجی کی ریفرنس تھی۔



یہ شام بھی کہاں ہوئی

جس خاص مقصد کے لئے یوسف ممبئی آیا ہوا تھا۔ وہ عزیز بھائی کی تکلیف دِہ مہمان نوازی کی وجہ سے اب تک اِلتوا میں پڑا ہوا تھا۔ ممبئی میں آج اُس کا پندرھواں دِن تھا۔ اور ان پچھلے پندرہ دِنوں میں اُسے ایک بار بھی ایسا موقعہ نہ مِلا تھا جب وہ عزیز بھائی کے مکان کے دروازے سے اکیلا باہر نِکل سکا ہو۔

''ممبئی بہت خراب جگہ ہے میاں۔ یہاں کی سڑکیں جس قدر صاف اور کُشادہ ہیں، لوگوں کے دِل اتنے ہی گندے اور چھوٹے ہیں''۔

''چاچا...... میں بھی کوئی چھوٹا بچّہ نہیں...... میں نے بہت دُنیا دیکھی ہے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ لیکن یہ مت بُھولو کہ زندگی میں پہلی مرتبہ کشمیر کے باہر کا آسمان دیکھ رہے ہو۔ تُمہارے کشمیر اور ہماری ممبئی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تمھیں ممبئی دیکھنے کا شوق ہے۔ میں تُمھارا یہ شوق پُورا کروں گا۔ خوش قِسمتی سے میں آج کل زیادہ مصروف بھی نہیں ہوں...... اسلم اور فریدہ کی بھی چُھٹیاں ہیں۔ لہٰذا تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت

نہیں۔ اسلم اور فریدہ نے ایک ماہ کے لئے تُمھارا پروگرام پہلے ہی تیار کر کے رکھّا ہے۔ اب کسی اچھے لڑکے کی طرح سو جاؤ۔ صُبح تُمھیں اسلم باندرہ لے جائے گا۔"

پہلے ہی دِن شام کا کھانا کھانے کے بعد جب عزیز بھائی یُوسف کا سر تھپتھپا کر باہر چلے گئے تھے تو یُوسف کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اور اُسے اپنے باپ پر بے حد غُصّہ آیا تھا۔ اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ ابھی، اسی وقت یہاں سے کہیں اور چلا جائے! اُس کی اٹیچی میں وہ پانچ سو روپے بھی تھے جن کا عِلم نہ اُس کے باپ کو تھا اور نہ عزیز بھائی کو۔ یہ پانچ سو روپے اُس کی ماں نے اُسے الگ طور سے دیئے تھے۔ لیکن وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ پچھلے تین برس سے وہ مِنّت سماجت کرتا چلا آ رہا تھا۔ کہ اُسے ممبئی گھومنے کے لئے بھیج دیا جائے۔ اور اُس کا باپ بڑی مُشکل سے راضی ہوا تھا۔ لیکن اس شرط پر کہ اُسے ممبئی میں عزیز بھائی کے ہاں رہنا ہوگا اور عزیز بھائی کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ کرنا ہوگا۔ اُس کے باپ نے عزیز بھائی کے نام کم از کم دو درجن نجی خط لکھے تھے۔ اور ہر خط میں انھیں تاکید کی تھی کہ یُوسف کو اکیلا کہیں بھی نہ بھیجا جائے۔

یُوسف گذشتہ پندرہ روز سے برابر سوچ رہا تھا کہ وہ کِس طرح عزیز بھائی کو چکمہ دے سکتا ہے۔ آج اُسے اُمید کی ایک ہلکی سی کِرن نظر آ رہی تھی۔ عزیز بھائی کی سب سے چھوٹی لڑکی کی سالگرہ تھی۔ گھر میں خُوب چہل پہل تھی۔ شام کو قوالی کا پروگرام تھا۔

رات کے ٹھیک بارہ بجے جب عزیز بھائی اور اُن کے مہمان قوالوں کے

ساتھ جھوم رہے تھے، وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔

رات جوان تھی۔ اُس نے ممبئی کی راتوں کے بارے میں جو سُنا تھا وہ دیکھ رہا تھا۔ محمد علی روڈ جگمگا رہا تھا۔ بھنڈی بازار سے ہوتا ہوا وہاں پہنچا تو اُسے اپنے دِل کی دھڑکنیں صاف سُنائی دیں...... چند قدم کے فاصلے پر اُس کی منزل تھی...... صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ لیکن یہ چند قدم اُسے زندگی کے سب سے بھاری قدم لگ رہے تھے۔ روشنیاں ہی روشنیاں...... روشنیوں کے اس سمندر میں وہ کھو سا گیا...... بظاہر وہ تاج سینما کے بڑے بڑے اشتہار دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا ذہن جہلم کے کنارے اُگے ہوئے سفیدوں کی چھاؤں میں بھٹک رہا تھا...... ۔

''میں ممبئی کا رہنے والا ہوں...... تمہارے کشمیر میں گھومنے آیا ہوں......''۔

اُس آدمی کے چہرے پر ایک کمینی سی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک سفیدے کے سایے میں کھڑا تھا۔ اور حریص نِگاہوں سے اُن عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو قریب کے کھیتوں میں نرائی کر رہی تھیں۔ اُن میں یُوسف کی ماں بھی تھی...... پانچ رُوپے کا ایک چمکیلا نوٹ یُوسف کی طرف بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

''جاؤ...... اُس عورت کو دے دو جس نے نیلا پھرن پہن رکھا ہے......!''

''وہ میری ماں ہے'' ۔

''اچھا...... یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ دیکھو تُمھاری ماں کا پھرن کتنا پُرانا اور گندہ ہے۔ پانچ رُوپے میں وہ اپنے لئے ایک نیا پھرن بنوا سکتی ہے۔

اور پھر میں تمہیں الگ سے ایک روپیہ دوں گا...... چاندی کا......"۔

یکا یک جہلم جاگ پڑا تھا۔

یُوسف کے باپ نے اس ممبئی والے کا گریباں پکڑ لیا تھا......"لفنگے، لُچّے، بدمعاش۔ یقیناً اس بچّے کی ماں کے پاس صرف ایک ہی پھرن ہے۔ لیکن اس گندے پُرانے پھرن کے نیچے اُس نے عزّت اور غیرت کا ایک ایسا پھرن پہن رکھا ہے جو بہت قیمتی ہے۔"

جب وہ سیّاح یُوسف کے باپ کے ہاتھوں پِٹ کر توبہ توبہ کرتا ہوا بھاگ رہا تھا، تو یُوسف کے ننّھے ذہن میں ممبئی کے اس آدمی کے خلاف نفرت کا لاوا اُبلنے لگا تھا۔ اور آج پندرہ برس کے بعد وہ ممبئی کے تاج سینما کے سامنے کھڑا ممبئی کے ہزاروں آدمیوں کو اپنے سامنے سے گذرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ روشنیاں اور تیز ہو رہی تھیں اور اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی میلے میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہو...... ۔

اُس روز وہ بابا ریشی کے میلے سے واپس گھر لوٹ رہا تھا۔ اپنے باپ کے مضبوط کندھے پر بیٹھ کر دس ہزار فٹ کی بلندی سے اُسے ساری دُنیا نظر آ رہی تھی۔ اُس کا باپ بار بار اُس کی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا...... نہ صرف اُس کا باپ بلکہ دیودار کے ایک بہت اُونچے پیڑ کے سایے تلے بیٹھا ہوا وہ انگریزی ٹوپی والا بھی اُس کی ماں کی طرف کُچھ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یُوسف کو اُس کی ٹوپی سے زیادہ وہ کھلونا اچھّا لگا تھا جو ٹوپی والا بار بار اپنی آنکھ سے لگا رہا تھا۔

''اے بابو......تصویر مت اُتارو۔''

''ہم......ممبئ کے ایک بہت بڑے میگزین کا فوٹو گرافر ہے۔ تُمھاری بیوی کا فوٹو میگزین میں چھپے گا۔ کشمیر کا حُسن اکھا دُنیا کے لوگ دیکھے گا۔ اور تُمہاری بیوی کو پانچ رُوپے کا ایک نوٹ ابھی ابھی مِلے گا......'' ''بزنس اِز بزنس!''

یہ پانچ رُوپے کے نوٹ نہ جانے کیوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تصویر اُتارنے والا پانچ پانچ کے دو نوٹ دینے کے لئے تیار ہوا تھا۔ یُوسف کی ماں کی صرف ایک تصویر کے لئے۔

''ہرگز نہیں......میری بیوی کا فوٹو کسی کتاب میں نہیں چھپے گا۔ تُم ایک لاکھ رُوپے ہی کیوں نہ دو......اور اگر تُم نے فوٹو لِیا تو ایک مُکّے سے تمہیں ممبئ پہنچا دوں گا۔ یُوسف کی ماں......بُرقعہ پہن لو......''۔

''نیچے......وادی کے بیچوں بیچ جہلم اطمینان سے بہہ رہا تھا۔''

''ابّا......تُم نے اُس ممبئ والے کو ماں کا فوٹو کیوں نہیں اُتارنے دیا؟''

پانچ ہزار فُٹ نیچے اُتر کر جب یُوسف نے اپنے باپ سے یہ سوال پُوچھا تھا تو اُس کے باپ نے اُسے اپنے کندھے سے اُتارتے ہوئے کہا تھا:۔

''بیٹے ہم شریف آدمی ہیں۔''

''ابّا شریف آدمی کیا ہوتا ہے؟''۔

''شریف آدمی۔ شریف آدمی ہوتا ہے۔ تصویریں لینے والا آدمی شریف آدمی نہ تھا۔''

''شریف آدمی۔ یُوسف نے اُس وقت اپنے ذہن پر بہت زور دیا تھا،

لیکن وہ نہ سمجھ سکا تھا کہ شریف آدمی کیا ہوتا ہے......اور آج ممبئی کے تاج سینما کے سامنے کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ خُود ایک شریف آدمی ہے۔ لیکن پچھلے پندرہ برس سے شرافت اور کمینہ پن کی تجربہ گاہوں میں اُس نے جب بھی اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی تھی تو اُسے اپنے اندر ہر جگہ آگ ہی آگ نظر آئی تھی......نفرت کی آگ ......اپنے شہر کی کسی سڑک پر جب بھی وہ کسی ممبئی والے سیاح کو دیکھتا تو یہ آگ اور تیز ہو جاتی......۔

کالج کے پہلے سال میں اُسے معلوم ہوا کہ نہ صرف ممبئی کے مرد بلکہ ممبئی کی عورتیں بھی خراب ہوتی ہیں۔ ممبئی کی عورتیں پانچ رُوپے کے ایک نوٹ میں رات بھر کے لئے خریدی جاسکتی ہیں۔ وہ لمبے لمبے پھرن نہیں پہنتیں۔ وہ بڑی خوشی سے اپنی تصویریں میگزینوں میں چھپواتی ہے۔ فوٹو کھنچواتے وقت وہ جس قدر کم لباس میں ہوں، انھیں اسی قدر زیادہ پیسہ ملتا ہے ......! چند قدم......صرف چند قدم...... چند قدم کے فاصلے پر اُس کی منزل تھی۔ راستہ صاف تھا۔ روشنیاں تیز تھیں۔ اس قدر تیز کہ سامنے والی کتابوں کی دُکان میں لٹکے ہوئے رسالوں کے نام بخُوبی پڑھے جاسکتے تھے۔ کتابیں اُس کی سب سے بڑی کمزوری تھیں......اُس دُکان میں تو سب کچھ نظر آرہا تھا۔ مذہب، سیاست، تاریخ، سیکس، نفسیات، فلم، ادب......... وہ دوبارہ کھو گیا۔ اپنے کالج کی لائبریری کے پُرسکون ماحول میں وہ اسی طرح کھو جایا کرتا تھا۔

اُس ناول کا نام......"کشمیر کی کلی" تھا۔ وہ ممبئی کے ایک مشہور و معروف ناول نگار نے لکھا تھا۔ ناول پڑھ کر وہ اور بھی دِل برداشتہ ہوا تھا۔ اپنے اُردو

کے پروفیسر سے اس ناول کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے اُسے معلوم ہوا تھا، کہ کشمیر سے متعلق جو کچھ بھی لِکھا جاتا ہے اُس میں حقیقت کم اور مبالغہ آرائی زیادہ ہوتی ہے۔

''یوسف بیٹے! یہ لوگ پیسے کیلئے ہمارے کشمیر کو بیچتے ہیں۔ لوگ ممبئ کے عالی شان ائیر کنڈیشنڈ فلیٹوں میں بیٹھ کر ہمارے کشمیر کے متعلق اور لِکھ بھی کیا سکتے ہیں۔ وہی عشقیہ داستانیں۔ ان کی نظر میں کشمیر کی ہر عورت کی قیمت پانچ رُوپے ہے۔ انھیں یہاں کی بُھوک، بیماری، جہالت اور ناداری کیسے نظر آسکتی ہے۔''

ایک تیز رفتار گاڑی کے تیز ہارن نے اُسے چونکا دیا۔ تاج سینما کا آخری شو ختم ہو رہا تھا اُس نے اپنی جیب ٹٹولی...... ۔

''پانچ سَو رُوپے...... میں ممبئ کی کم از کم ڈھائی ہزار عورتیں خرید سکتا ہوں ......وہ آگ جو میرے دِل کے کسی کونے میں، رُوح کے کسی حصّے میں لگی ہوئی ہے، کچھ تو کم ہو سکتی ہے۔''

اُس کے نتھنے پُھولنے لگے......وہ آگے بڑھا...... ۔

سالونی سی اُس عورت نے بے حد مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے سینے کی لکیر تو واضح طور نظر آ رہی تھی۔

''کیا تُم ممبئ کی رہنے والی ہے؟''

وہ بڑی بے حیائی سے ہنس پڑی اور پھر بولی:۔

''بابو......اکھا ممبئ میں اپن ممبئ کی خالی عورت ہے۔''

''اس بازار میں ممبئ کی اور کتنی عورتیں ہیں؟''

''بابُو......سب ممبئی کی عورتیں ہیں۔ اس بازار میں جو بھی عورت آتی ہے وہ ممبئی والی ہو جاتی ہے......''۔

عین اسی لمحے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''جلدی کرو......بابو......ہم تین عورتوں کے پاس ایک ہی کمرہ ہے۔ ممبئی میں عورت جتنی سستی ہے رہنے کے لئے جگہ اتنی ہی مہنگی ہے۔''

''کیا وہ دونوں تمہاری طرح ممبئی کی عورتیں ہیں؟''

''ہاں۔ کیوں؟''

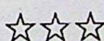
''بُلا لو! انھیں بھی اندر......میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

وہ کُچھ سوچتے ہوئی اُٹھی اور دروازہ کھولا۔

مدھو، رضیہ۔ اندر آؤ۔ اس سالے کا مغز پھریلا ہے۔''

اُن دونوں کا رنگ گورا تھا۔ بے حد گورا۔ یُوسف نے پانچ پانچ رُوپے کے دو نوٹ اُن کی طرف بڑھائے۔

وہ دونوں کِھل کِھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر اُن میں سے ایک نے دوسری سے کُچھ کہا۔ اور کمرے میں موجود صرف یُوسف اس بات کو سمجھ سکا۔ اور اُس کا سانس اُوپر کا اُوپر ہی رہ گیا۔ بھلا وہ صرف پندرہ روز میں اپنی مادری زبان کو کیسے بھول سکتا تھا......!!



پرچھائیاں!

وہ سات آٹھ برس کا خوبصورت سا لڑکا آپ کو اکثر شالیمار ہوٹل کے سامنے لگے ہوئے لکڑی کے گھاٹ پر اپنا چھوٹا سا شکارہ لئے ہوئے نظر آئے گا۔ اُس کا نام رحمان ہے۔ لیکن دیگر شکارے والے کبھی کبھار ہی اُس کو اس نام سے پُکارتے ہیں۔ عام طور پر وہ ''جرمنی'' کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔ کیونکہ عام لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دراصل اُس جرمن سیاح......!

لیکن ٹھہریئے۔ اس سے پہلے رحمان کے بارے میں کوئی سنسنی خیز انکشاف منظر عام پر آجائے۔ میں آپ کو ایک پاگل آدمی سے ملانا چاہتا ہوں جو رحمان کو اپنا بیٹا کہتا ہے۔

اُس پاگل آدمی کا نام جبارا ہے۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے۔ برسوں پُرانا غلیظ اور پھٹا کمبل اوڑھے ہوئے عام طور پر مخدوم صاحب کی زیارت گاہ کے اطراف میں منڈلاتا نظر آتا ہے۔ اب تک زیارت گاہ کی دوسری طرف پاگل خانے کی اونچی اُونچی دیواروں کے پیچھے پہنچنے سے اسلئے بچا ہوا ہے کہ وہ عام حالات میں پاگل نظر نہیں آتا ہے۔ مجھے تو وہ کسی صورت میں پاگل نہیں لگتا۔ دوسرے لوگ شاید اس وجہ سے اُس کو پاگل سمجھتے ہوں کہ وہ بعض اوقات ڈل کے کنارے ایک مخصوص چنار کے تنے کے

ساتھ ٹیک لگائے خاموش نظروں سے مغربی اُفق کو تکتا ہُوا دکھائی دیتا ہے اور کبھی کبھی اپنی پھٹی پُرانی قمیض کی جیب میں سے ایک کاغذ نکالتا ہے۔ خاموشی سے اُس پر لکھی ہوئی عبارت کو دیکھتا رہتا ہے اور پھر کسی راہ گیر کا دامن تھام کر وہ کاغذ اُس کی طرف بڑھاتا ہے۔

''صاحب۔ پڑھکر سُناؤ!''

اور جب اس کاغذ کی عبارت ختم ہو جاتی تو وہ ایک گہری سانس لیکر راہ گیر سے پوچھتا ہے۔

''صاحب۔ کیا آپ بھی میرے رحمان کو حرامی سمجھتے ہیں۔؟''

اور راہ گیر یکایک اس راز سے آشکارہ ہو جاتا ہے کہ اس کا پالا کسی پاگل آدمی سے پڑا ہے۔ اور اب اس جگہ سے بھاگ جانا چاہئے۔ کیونکہ اس آدمی کے دانت بڑے خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔

جبارا پاگلوں کی طرح کاٹتا بھی نہیں۔ ہاں اُس وقت جب اُس کے سامنے کوئی رحمان کو جرمنی کے نام سے پُکارتا ہے تو اُس وقت اُس کی آنکھوں میں سچ مُچ پاگلوں جیسی وحشت ٹپکنے لگتی ہے۔ اور مُنہ کے کونوں سے جھاگ بہنے لگتی ہے اور اگر بیچ بچاؤ کرنے والے جلدی سے میدان میں کود نہ پڑیں۔ تو یقیناً رحمان کو جرمنی پُکارنے والے کو جھنجھوڑ کر رکھدے!

رحمان بہت خاموش رہنے والا لڑکا ہے۔ نہ دوسرے ہانجی لڑکوں کے ساتھ بنڈ پر جُوا کھیلتا ہے اور نہ سگریٹ کے ٹوٹے کان کے پیچھے رکھتا ہے خاموشی سے اپنے شکارے میں بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی گاہک مل جاتا ہے تو

خاموشی سے چپّو سنبھال کر اس کو ڈل کے پار لے جاتا ہے۔

میں اکثر اُسی کے شکارے میں بیٹھ کر ملہ سُبحان کے ہاؤس بوٹوں تک جاتا ہوں۔ جہاں میں ملہ سُبحان کے بچّوں کو پڑھاتا ہوں۔ ملہ سُبحان چار ہاؤس بوٹوں کا مالک ہے۔ ایک ہاؤس بوٹ جس کا نام ''پرائیڈ آف کشمیر'' ہے اور جو بہت خوبصورت ہے اُس کے بارے میں، میں نے سُنا ہے کہ یہ کبھی جبارے کا تھا۔ جس پر ملہ سُبحان نے جبارا کے پاگل ہو جانے کے بعد زبردستی قبضہ جمالیا ہے۔ اس ہاؤس بوٹ کے قریب ایک خستہ حال ڈونگہ نظر آتا ہے۔ اس میں رحمان اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ رہتا ہے!! آج سے دو برس قبل جب میں نے ملہ سُبحان کے بچّوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ وہ پہلے ہی دن مجھے شکارے میں بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔ شکارے والے مر بھکوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ سے پڑے تھے لیکن جانے کیوں میرے قدم خود بخود اُس کے شِکارے کی طرف اُٹھے تھے۔

اب ان دو برسوں میں وہ میرا ایک بہت ہی اچھا دوست بن گیا ہے ان دو برسوں میں لوگوں سے اُس کی ایک لمبی کہانی سُن چکا ہوں جس کا لب لباب یہ ہے کہ اُس کی ماں کا شوہر یعنی جبارا ایک بہت ہی خوبصورت ہاؤس بوٹ کا مالک تھا۔ جن دنوں جبارا نے اپنی شادی رچالی اُن ہی دنوں اُس کے ہاؤس بوٹ میں ایک جرمن سیاح ایک ماہ کیلئے بیٹھا۔ جبارا کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ جبارے کو شک ہُوا کہ اُس کی بیوی اور اُس جرمن سیاح میں بُرے تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ ایک ماہ بعد جب وہ سیاح چلا گیا تو جبارے نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ اُس کی بیوی روتی رہی چلّاتی رہی۔ مخدوم

صاحب کی زیارت گاہ میں خدا اور رسولؐ کی قسم کھائی کہ وہ پاکباز ہے اور جو وجود اس کے پیٹ میں پل رہا ہے وہ جبارے کا ہے۔ لیکن جبارا اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ چند ماہ بعد رحمان پیدا ہوا۔ اُس روز جبارا خود اپنے سُسرال چلا گیا لیکن اپنے شکارے ہی میں بیٹھا رہا۔ صرف اپنی ساس سے کہا کہ اُس کو بچّہ دکھایا جائے اور بچّے کو دیکھتے ہی اُس نے اپنے ہونٹ نفرت سے سکوڑ لئے۔! بچّہ ہو بہو اُس جرمن سیاہ کی شکل پر گیا تھا۔ وہی گہری نیلی آنکھیں، وہی اخروٹ کی رنگت لئے ہوئے چمکیلے بال۔! اُسی شام جبارے نے اپنی بیوی کو طلاق بھیجی۔ اور کُھلے عام اعلان کر دیا کہ بچّہ اُس کا نہیں ہے۔ دوسری صبح جب اُس نے یہ خبر سُنی کہ اُس کی بیوی مرگئی ہے تو لوگوں نے اُس کو کہتے ہوئے سُنا کہ اُس کے لئے مرجانا ہی اچھّا تھا!

یہ ہے وہ کہانی جو میں رحمان کے متعلق سُن چکا ہوں۔ لیکن رحمان اپنے بارے میں صرف اتنا جانتا ہے کہ اُس کا نام رحمان ہے۔ لوگ اُس کو کسی خاص وجہ سے جرمنی کے نام سے پُکارتے ہیں۔ اُس کی ماں مرگئی ہے۔ اُس کا باپ پاگل ہو گیا ہے اور اُس کی دادی صرف اُس کے لئے زندہ ہے!

ایک روز میں نے رحمان سے پوچھا۔ ''یہ لوگ تم کو جرمنی کے نام سے کیوں پُکارتے ہیں۔'' جواب میں اُس کے موتیوں جیسے دانت نمودار ہو گئے۔ جیسے کچّی مکی کے سپید دانے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور پھر اپنا خوبصورت گلابی نچلا ہونٹ باہر کی طرف اُلٹ دیا۔

یعنی ''معلوم نہیں۔!''

میں مُسکرا پڑا تھا!

جبار مجھے اکثر اُسی بوڑھے چنار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے نظر آتا ہے۔ چونکہ گھاٹ تک سائیکل سے آتا۔ اسی لئے میں اُس کاغذ کی عبارت کو بہت دنوں تک نہ پڑھ سکا۔ حالانکہ کئی بار میرا دل چاہا تھا کہ میں بھی اس کو دیکھ لوں کہ اس میں ایسی کیا بات ہے جو وہ اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔

ایک روز جبکہ میری سائیکل کے پچھلے ٹائیر نے شدت کی گرمی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور میں پیدل ہی گھاٹ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ یکا یک اُس نے میرا راستہ روک دیا۔ اُس کے ہاتھ میں وہی کاغذ لرز رہا تھا۔

''صاحب! اِسے پڑھ کر سُناؤ!''

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کاغذ کھولا۔ اس کی عبارت پچھلے پہر کے چاند کی طرح ماند پڑ گئی تھی۔ لیکن مفہوم اچھی طرح سمجھا جا سکتا تھا!

جب میں عبارت پڑھ چُکا تو یکا یک اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''صاحب! کیا آپ بھی رحمان کو حرامی سمجھتے ہیں؟''

میں ایک طویل سانس لیکر رہ گیا۔ اُس نے پھر ایک بار وہی سوال دُہرایا۔ میں نے اُسکی طرف اپنی نظریں اُٹھا دیں۔

''ہاں......وہ حرامی ہے!''

''صاحب......'' وہ چیخ پڑا۔ اور دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھوں سے کاغذ چھین لیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کو توڑ مروڑ کر اپنی جیب میں ٹھونس دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری طرف چھلانگ لگا دے گا۔ اور اپنے تیز نوکیلے

دانت میرے جسم کے کسی حصّے میں گاڑھ دے گا۔ لیکن اُس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح وحشت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر رُندھے ہوئے گلے سے بولا۔

''صاحب! یہ خط پڑھ کر بھی آپ......!''

''اس خط سے کیا ہوتا ہے۔'' میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے آج سے آٹھ برس پہلے خود ہی رحمان کی ماں پر الزام لگایا تھا۔ اور اب جو تم پاگلوں کی طرح ہر آنے جانے والے کو اپنا یہ خط دکھاتے رہتے ہو۔ اس سے وہ الزام مٹ نہیں سکتا۔ اس سے صرف تمہارے دل کو ایک جھوٹی تسکین مل جاتی ہے۔''

''صاحب میں پاگل نہیں ہوں میں صرف لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ رحمان میرا خون ہے۔ اور یہ خط اس کا ثبوت!''

''یہ تمہاری بھول ہے۔ اگر وہ حرامی نہیں تو تم نے اس کی ماں پر الزام کیوں لگایا تھا۔ اُس کو طلاق کیوں دی تھی۔ رحمان کو اپنا بیٹا ماننے سے کیوں انکار کر دیا تھا!''

''میں اُس وقت پاگل ہو گیا تھا۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ عائشہ نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ لیکن......''

یکایک اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چُھپا لیا اور پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اسی حالت میں روتا رہا۔ اور پھر اپنا بھیگا ہوا چہرہ میری طرف اُٹھاتے ہوئے بولا۔

''صاحب۔ میں اس دُنیا کا سب سے بڑا بدنصیب انسان ہوں۔ میرا سب کچھ تباہ ہوگیا۔ عائشہ مجھ سے روٹھ کر چلی گئی۔ ہاؤس بوٹ سے ہاتھ دھونے پڑے، دُنیا مجھے پاگل سمجھنے لگی۔ اور میرے رحمان کو ستاتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ بابو جی! آپ پہلے انسان ہیں، جس نے مجھے پاگل نہیں سمجھا۔ مجھ پر ہنسا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے عائشہ پر الزام لگایا تھا۔ لیکن اُس وقت میں پاگل ہوگیا تھا۔ عائشہ اور میں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ہمارا رشتہ بچپن ہی میں طے ہو چکا تھا۔ جن دنوں ہماری شادی ہوگئی۔ اُن ہی دنوں ایک جرمن سیاح ہمارے ہاؤس بوٹ میں بیٹھا۔ صورت سے وہ بھلا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ پیسے پانی کی طرح بہاتا تھا شروع کے دو چار دن بڑے آرام سے گذرے۔ لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ وہ عائشہ میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ میں اکثر اُس کو عائشہ کی طرف کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے پاتا اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ عائشہ بھی اُس کا کچھ خیال رکھتی ہے۔ ایک روز جب میں رات گئے ہاؤس بوٹ کی طرف لوٹ رہا تھا۔ تو میں نے عائشہ کو اُسکے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ جرمنی اُس کے لئے کچھ قیمتی کپڑے لے آیا تھا۔ اس روز میں خاموش رہا۔ لیکن بعد میں مجھ سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ عائشہ میری زندگی میں اُس کے کمرے میں چلی جاتی اور جب واپس آجاتی تو خالی ہاتھ نہ ہوتی۔ ابتک وہ سیاح اُس کے لئے ہزاروں رُوپے کے تحفے خرید کر لایا تھا۔ میں نے عائشہ کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ اس سیاح کے کمرے میں نہ جایا

کرے۔ عائشہ میرا یہ حکم سُن کر بھونچکا رہ گئی۔ لیکن بولی کچھ بھی نہیں!

دوسرے روز سیاح خود ہی عائشہ کو ڈھونڈتا ہوا ڈونگے تک آیا میں نے سختی سے جھڑک دیا۔ ایک ماہ بعد جب وہ چلا گیا۔ تو میرے دل کے اندر شک کا پودا اپنی جڑیں مضبوطی کے ساتھ جما چکا تھا۔ اور ایک ہی ہفتہ کے بعد میں نے عائشہ کو گھر سے نکال دیا۔ اور پھر جب رحمان پیدا ہو گیا۔ تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ عائشہ نے دنیا سے مُنہ موڑ لیا تو اُس وقت نہ جانے کیوں سکون سا مل گیا۔ میں سمجھ بیٹھا کہ اُس کی بدنُما کہانی اُسی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اور میں بُھول گیا کہ عائشہ نے کبھی مخدوم صاحب کی زیارت گاہ پر اپنی وفاداری کی قسمیں اُٹھائی تھیں۔ لیکن تین ماہ بعد جب یہ خط ملا تو میرے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں پاگل ہو گیا۔ بابو جی یہ خط۔ یہ میری عائشہ کی پاکیزگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ بابو جی! اِسے ایک بار پھر پڑھ لیجئے......"۔

اُس نے وہ خط ایک بار پھر میری طرف بڑھا دیا۔ خط انگریزی زبان میں تھا۔ میں اُس کو اپنی زبان میں سنانے لگا۔

ڈِیر جبارا!

یہ سُن کر تُمہیں نہایت خوشی ہوگی کہ میں ساری دنیا کا چکر لگا کر واپس آ گیا ہوں۔ تم یقین جانو کہ میں جہاں بھی گیا وہاں تم لوگ مجھے یاد آتے رہے۔ کیونکہ تمہاری مہمان نوازی اور تمہارا خلوص مجھے کہیں اور نہ ملا۔ ایک مہینہ جو تمہارے ہاؤس بوٹ میں گزارا۔ وہ دن میری زندگی کے سب سے اچھے دن تھے۔ عائشہ کیسی ہے، جبارا میں اس خط میں تم کو ایک چھوٹی سی کہانی سُنانا چاہتا

ہوں۔ شاید تم اس بات سے واقف ہو گے کہ دنیا میں حال ہی میں دو ایسی خطرناک جنگیں لڑی گئیں۔ جنہوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت میں صرف چار برس کا تھا۔ اس جنگ کے دیو نے میرے ماں باپ اور میرے تین بھائیوں کو کھا لیا صرف میں اور میری چھوٹی بہن بچ سکے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم نے میری ''بہن'' کو بھی مجھ سے جُدا کر دیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ مجھے عائشہ کی صورت میں تمہارے ہاؤس بوٹ میں نظر آ گئی۔

پہلے ہی روز جب میں نے اُس کو دیکھا تو میں سمجھا تھا کہ وہ میری بہن کی رُوح ہے۔ ان دونوں میں صرف لباس کا فرق تھا۔ بہر حال عائشہ مجھے اپنی بہن ہی کی طرح عزیز ہے۔ اور جب تک میں زندہ رہوں گا میں یہی سمجھتا رہوں گا کہ میری بہن نے دوسرا جنم لیا ہے۔ اس خط کے ساتھ ہی تمہیں ایک پارسل ملے گا۔ اُس میں میری بہن کے لئے اپنے بھائی کی طرف سے کچھ سوغات ہے۔ اور تمہارے لئے ایک گھڑی۔ خط کا جواب بہت جلد دینا۔ اور عائشہ کا اور اپنا ایک فوٹو ارسال کرنا۔

اچھا خدا حافظ!

تمہارا فرینک ڈان وِچ

میں نے اُس کی طرف اپنی نظریں اُٹھا دیں۔ اُس نے مجھ سے پُوچھا۔

''کیا آپ اب بھی میرے رحمان کو حرامی سمجھتے ہیں؟''

میں نے خاموشی سے ڈل کی طرف اپنی نظریں اُٹھا دیں۔

رحمان کسی سواری کو ڈل کے پار لے جا رہا تھا۔

☆☆☆

وطن

گاڈ نے اپنا سبز جھنڈا ہوا میں لہرایا اور دو مرتبہ سیٹی بجائی...... گاڑی چیونٹی کی رفتار سے آگے کھسکنے لگی۔ غلام رسول نے اپنا مختصر سا سامان اُوپر والی نشست پر رکھ دیا اور خود ایک سگریٹ سُلگا کر نچلی سیٹ پر بیٹھ گیا...... بھارت جانے والی سپیشل گاڑی کے اس کمپارٹمنٹ میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی...... کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے مسافر دُور ہوتے ہوئے لاہور کے سٹیشن کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے......

کمپارٹمنٹ کے اگلے حصّے میں چند سکھوں نے اپنا ڈیرہ جمایا تھا۔ وہ شاید ننکانہ صاحب کی زیارت کر کے وطن لوٹ رہے تھے۔ اُن کے بعد کچھ تاجر قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام رسول کی نشست کے قریب والی نشست پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور ایک سولہ، سترہ برس کی جوان لڑکی بیٹھی تھی...... بات چیت سے وہ دونوں پنجابی لگ رہے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ایک غمزدہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پھر جب گاڑی نے رفتار پکڑ لی تو کمپارٹمنٹ پر چھایا ہوا بوجھل سنّاٹا بھی دھیرے دھیرے ٹوٹنے لگا۔ سکھ زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ اُن کے پیچھے بیٹھے ہوئے تاجر تاش کھیلنے لگے...... اور ادھیڑ عمر کے آدمی نے غلام رسول

سے پوچھا۔

''آپ شاید کشمیری ہیں......''۔

غلام رسول نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

یہ بڑی عجیب سی بات ہے کشمیری برصغیر کے کسی بھی حصّے میں چلا جائے وہ وہاں اپنی بول چال اور رنگ ڈھنگ سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔

''امرتسر کس سلسلے میں جا رہے ہیں۔؟''

''کشمیر جانے کے لئے......!'' غلام رسول کے رندھے ہوئے لہجے کو اُن دونوں نے محسوس کیا......لڑکی نے اپنی بڑی بڑی سہمی ہوئی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھا دیں......۔

میرا نام انور علی ہے۔ یہ میری بیٹی ہے......ادھیڑ عمر کے آدمی نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا......''ہم لوگ جموں جا رہے ہیں......وہاں......!'' وہ یکدم خاموش ہو گیا......!

غلام رسول کے دل میں آگ کی ایک لکیر سی کھینچ گئی......وہ جان گیا تھا کہ ادھیڑ عمر کا آدمی کیوں یک لخت خاموش ہو گیا ہے۔ اُس کے جی میں آیا کہ وہ چیخ چیخ کر اُس سے کہے......''آپ بولتے بولتے خاموش کیوں ہو گئے۔ آپ کہتے کیوں نہیں کہ وہاں ہمارا گھر ہے۔ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ بچپن کے ساتھی ہیں۔ وہاں ہمارا سب کچھ ہے۔ ہم بھولی بسری یادوں کے ٹمٹمائے ہوئے چراغوں کی لَوئیں تیز کرنے جا رہے ہیں......سرحد کے اُس پار بھی یادیں ہیں اور سرحد کے اِس پار بھی یادیں ہیں......سرحد کا تیز کلہاڑا ان

یادوں کو مٹا نہیں سکتا...... لیکن...... ہم کتنے بے بس ہیں...... کتنے لاچار ہیں...... نہ جانے کب تک ہمیں لاچاری کے آنسو بہانا پڑیں گے......"۔

"آپ پاکستان میں کس جگہ رہتے تھے......" ادھیڑ عمر آدمی نے پوچھا۔

لیکن غلام رسول نے کوئی جواب نہ دیا...... وہ جواب دیتا بھی کیسے وہ اِس وقت بھارت جانے والی سپیشل گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اُس کے اندر...... بہت اندر...... جہاں اُس کی روح آباد تھی۔ گھپ اندھیرے میں یادوں کے الاؤ روشن ہورہے تھے...... یادیں...... بادام کے شگوفوں کی طرح کومل یادیں...... یمبرزل کے پھولوں کی طرح حسین یادیں......

گاڑی اپنی پوری رفتار سے رات کا مہیب سنّاٹا چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی......!

امرتسر...... سکھوں کا مقدّس شہر...... وہ پہلی بار یہاں آج سے بیس برس قبل آیا تھا۔ اپنے صاحب کے ساتھ۔ دو دن یہاں ٹھہر کر واپس راولپنڈی چلا گیا تھا......!

آج وہ گاڑی سے اُترا ہی تھا کہ ریلوے پولیس کے دو آدمی نہ جانے کہاں سے نمودار ہو کر اُس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے...... اُس کو سیدھا پولیس سٹیشن لے جایا گیا۔ لاہور میں اُس سے کہا گیا تھا کہ امرتسر میں کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے میں اُس کا بہت سا وقت ضائع ہو گا...... لیکن چند ہی منٹ بعد جب پولیس آفیسر نے اُس کے کاغذات دیکھ کر...... "ٹھیک ہے۔ جانے دو۔" کہا تو اُس کے دِل میں شگوفے کھل اُٹھے...... ریلوے

اسٹیشن سے باہر آتے ہی وہ اُس بس اڈے کی طرف بڑھا جہاں سے جموں کے لئے بسیں روانہ ہوتی تھیں۔ امرتسر سے پٹھان کوٹ پہلی، گاڑی رات کو جاتی تھی۔ لیکن اُس میں اتنا انتظار کرنے کی ہمت نہ تھی۔

فجر ہوتے ہی بسیں جموں کے لئے روانہ ہوگئی......!

بیس ۲۰ برس والے جموں اور آج کے جمّوں میں اُس کو کوئی خاص فرق دکھائی نہ دیا۔ مندروں کے کلس اُسی طرح سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے اور مبارک منڈی کے بندر اب بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تھے۔ لیکن سرینگر جانے والی بسیں ضرور بدل گئی تھیں۔

دوسرے دن جب سورج اپنی پہلی ملائم کرنیں بکھیر رہا تھا تو بس سرینگر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی...... دھیرے دھیرے مندروں کے چمکتے ہوئے کلس دُور ہونے لگے۔ اور پیر پنچال کی سرمئی چوٹیاں سفید دُھند میں اپنے سر اُبھارنے لگیں۔

"بس کتنے بجے سرینگر پہنچ جائے گی۔" ایک مسافر کنڈیکٹر سے پوچھ رہا تھا۔

"آٹھ بجے......"

"آٹھ بجے......" غلام رسول کی آنکھیں پیر پنچال کی چوٹیوں سے ہٹ گئیں۔ آٹھ بجے تو وہاں اندھیرا چھایا ہوگا......اُس کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے......!

بیس سال ایک بہت لمبی مُدّت ہوتی ہے......"

"میں گھر میں کیسے داخل ہو جاؤں گا......اُن کو دیکھ کر میرا کلیجہ تو نہ پھٹ

جائے گا...... وہ میرا منّو ...... تب تو صرف دو برس کا تھا۔ کیا وہ اب اپنے بدنصیب باپ کو پہچان سکے گا......؟ کتنا بڑا ہوا ہوگا...... جوان، تنومند اور......

زرینہ...... وہ مجھے ضرور پہچانے گی...... تب تو وہ جوان تھی...... لیکن چشمے والا وہ چنار تو اب اور بھی زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوگا۔ جہاں ہم دونوں بچپن میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے...... رات گئے تک...... میں دولہا بنتا...... اور زرینہ دُلہن اور زرینہ کی سہیلیاں دُکھ بھرے انداز میں بابُل چھوڑنے کا گیت گاتیں......

اور وہ زمستان کی پاکیزہ برف...... بادام کے شگوفے اور ڈل کے آئینے...... عشق پیچاں کی بیلیں...... موسم گرما کے شوخ چمکتے ہوئے پھول...... خزاں کے سنہری پتے...... بیس برس ایک لمبی مُدّت ہوتی ہے...... بیس برس...... زخموں کی مدھم آنچ، روح کو پگھلانے والی یادیں...... میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں...... مجھے سب کچھ یاد ہے...... مجھے اپنے وطن کا ایک ایک چنار یاد ہے...... اپنے وطن کے سینے پر بہنے والے دریا کی ایک ایک مخملی لہر میرے آنکھوں کے سامنے رقص کر رہی ہے......!

''میں خود کو کیسے بھول سکتا ہوں......!''

''سرینگر......!'' غلام رسول اپنی آنکھیں بمشکل کھول سکا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اندھا نہ ہو جائے...... کہیں اُس کا دھڑکتا ہوا دل دھڑکنا نہ بھول جائے۔

'صورہ' اُس نے ٹانگے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''فُل ٹانگہ......!'' ٹانگے والے نے پوچھا۔

''ہاں...... محلّے کے باہر ہی اُتار دینا......'' اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

ٹانگے والے نے گھوڑے کو چابک مارا مریل گھوڑا اہنہنایا۔ پھر آگے بڑھا۔

''صورہ آپ کو کِس جگہ جانا ہے...... میں خود وہاں رہتا ہوں۔'' ٹانگے والے نے پوچھا......

''علی محمد کے ہاں......''

''کون علی محمد......''

''جو چشمے کے پاس رہتے ہیں......''

''او اچھّا...... میروں کے ہاں...... جن کا لڑکا پاکستان میں مر گیا ہے۔ میں تو اُن کے نزدیک ہی رہتا ہوں۔ وہ بے چارے اب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ بیس برس سے اپنے اکلوتے بیٹے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن اب اُن کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا ہے......'' ٹانگے والا بول رہا تھا اور غلام رسول پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا...... ''جناب پچھلے برس ایک آدمی پاکستان سے آیا۔ اُسی سے ہم کو معلوم ہوا کہ بیچارہ غلام رسول مر گیا ہے۔''

''کون تھا وہ آدمی......''

''گُلہ وانی...... اِدھر آزاد کشمیر میں رہتا تھا......'' لیکن جناب آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں......''

''اسلئے کہ وہ آدمی جھوٹ بولا تھا۔ کیونکہ میں زندہ ہوں۔''

''آپ......'' ٹانگے والے کی آنکھیں حیرت سے اُبل پڑیں...... ''ہاں

بھائی...... میں ہی وہ بدنصیب ہوں...... میروں کا غلام رسولؔ۔"

"آپ غلام رسول ہیں......" ۔

ٹانگے والا دوسرے ہی لمحے گھوڑے پر اندھا دُھند چابک برسانے لگا...... ۔

صورہ کے چوک میں پہونچتے ہی وہ ٹانگے سے کود کر نیچے آیا اور پاس والی دُکان پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"ارے...... غلام رسولؔ پاکستان سے آیا ہے......" ۔

"دُکان پر بیٹھے ہوئے لوگ اُس کی بات اَن سُنی کر گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جبارا بہت چرس پیتا ہے۔ لیکن جب انہوں نے ٹانگے سے ایک دوسرے آدمی کو اُترتے دیکھا تو سوچے سمجھے بغیر ہی ٹانگے کی طرف لپکے......!

گلی تک پہنچتے پہنچتے غلام رسولؔ کے گرد اچھّی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی...... کچھ لوگوں نے اُس کو پہچان لیا۔

کچھ کو اُس نے پہچان لیا۔

بوڑھا ہو گیا ہے۔ ارے جب گیا تھا جوان تھا۔

بھئی بیس برس کے بعد لوٹا ہے۔

کہرام سا مچ گیا...... اُس کی آنکھوں سے آنسو خود بخود بہہ رہے تھے! گھر میں داخل ہوتے ہی اُس کے بوڑھے باپ نے اُس کو لپٹ لیا۔ باپ بیٹا بہت دیر تک ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر روتے رہے۔ بوڑھے باپ کے کندھے سے لگ کر ایک ادھیڑ عمر عورت خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی......! پھر...... شور کم پڑ گیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ رات

تیسرے پہر میں قدم ڈال رہی تھی۔ بوڑھا چنار خاموشی سے کھڑا تھا اور زرینہ اُس کے سینے سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

''مت رو...... زرینہ اب میں آگیا ہوں......''۔

''مجھے رُوکئے نہیں...... بیس برس سے یہ تمام آنسو پیتی چلی آرہی ہوں''۔

''میں جانتا ہوں......''۔

''آپ تو صرف بیس دنوں کے لئے گئے تھے......''بیس دن گذر گئے پھر اور بیس دن گذر گئے...... پھر اور بیس دن...... لیکن آپ نہیں آئے......''۔

''ہاں میں نہ آسکا...... ہندوستان بٹ رہا تھا۔ پاکستان بن رہا تھا...... ۔

''میں انتظار کرتی رہی...... لیکن ماں......''۔

''میں اُس روز بہت رویا۔ رونے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا''۔ جب مجھے ماں کی بیماری کی خبر ملی تو میں نے گلمرگ کے راستے آنے کی بہت کوشش کی۔ آلپتھر کی مغربی چوٹیوں تک پہنچ گیا...... لیکن پھر راستہ کھو دیا...... پکڑا گیا دو سال قید ملی...... ان بیس برسوں میں میرا ایک ایک پل تمہاری یاد میں گزرا۔ قسمت ہی خراب تھی۔ ایک بار پاس پورٹ ملتے ملتے رہ گیا۔ دوسری بار پاسپورٹ مل گیا تو بیمار پڑ گیا...... پورے چھ سال ہسپتال میں پڑا رہا۔ اب میں آگیا ہوں...... اب میں آگیا ہوں......'' اُس نے زرینہ کی گود میں سر چُھپا لیا...... ۔

رات دھبے پاؤں گزر رہی تھی اور وہ دونوں بیس برس کی منجمد یادوں کو پگھلا رہے تھے...... اور اُن کے الاؤ روشن کر رہے تھے۔ پھر مسجد سے اذان

بلند ہوئی......صُبح ہوگئی تھی۔

ایک دھماکہ سا ہوا۔

غلام رسول ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا...... ۔

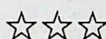
''میں کہاں ہوں......کیا بات ہے......؟''

''معلوم نہیں...... گاڑی خود بخود رُک گئی ہے۔ بھارت نزدیک آ گیا تھا......'' ۔

ادھیڑ عمر کے آدمی نے جواب دیا...... ۔

دفعتاً فضاء دھماکوں سے گونج اُٹھی۔ایک آدمی ہانپتا ہوا ڈبے میں داخل ہو کر بولا...... ۔

''پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہے۔گاڑی آگے نہیں جائے گی۔''



تاریخ ساز

میں اپنے آپ کو بڑی دیر سے تلاش کر رہا تھا۔

میرے سامنے مستند تاریخی کتابوں کے انبار لگ چکے تھے۔ان میں وہ تاریخیں بھی تھیں جن کی صحت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔جن میں مبالغہ آرائی نہ تھی، جن میں حالات واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا لیکن مجھے اپنا نام کہیں نظر نہیں آرہا ہے۔اسی اثناء میں سات آٹھ برس کا ایک معصوم بچہ اپنا قلم لے کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''جناب.......''۔

میں نے اُسے بری طرح جھڑک دیا۔

''دیکھتے نہیں میں مطالعہ کر رہا ہوں''۔

''میرا قلم ....جناب میں پچھلے دو گھنٹوں سے بے کار بیٹھا ہوں' میرا قلم بنائیے..مجھے بہت کچھ لکھنا ہے''۔

''کیا لکھنا ہے''۔

''تاریخ...چنگیز خان کے حالات زندگی اور فتوحات...''۔

''میرے پاس تمہارا قلم بنانے کیلئے وقت نہیں''۔

''لیکن آپ تو سب کام چھوڑ کر میرا قلم بناتے تھے۔آپ کو میرا بے کار

بیٹھنا کبھی گوارا نہیں ہوتا...''۔

''دیکھو بحث کرنے کی ضرورت نہیں ۔میں اس وقت ایک اہم کام کر رہا ہوں، لہذا تمہارا قلم نہیں بنا سکتا''۔

''پھر آپ میرا قلم کب بنائیں گے''۔

''جب تک ان تمام کتابوں کے مطالعے سے فارغ نہیں ہوتا''۔

''آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟''۔

''اپنے آپ کو.....میں تاریخ میں اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہوں'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔جس میں معصومیت بھی تھی اور علم کی مکاری بھی...''بے ادب'' اُس کا ہنسنا بند نہ ہوا، ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے

''بھلا ان کتابوں میں آپ کا نام کیسے ہوگا۔''

''کیوں''۔

''اُن میں ہزاروں سال قبل کے واقعات درج ہیں ۔آپ اس وقت''۔

''بے وقوف لڑکے...کیا تم سمجھتے ہو کہ میں دیوانہ ہوں۔پاگل ہوں، میں اپنے آپ میں موجود ہوں۔ میری یاداشت کے پھول صدیوں سے پھیلے ہوئے ہیں۔تمہیں حیرت تو ضرور ہوگی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں اب تک سینکڑوں جنم لے چکا ہوں۔میں نے ہزاروں برس جنم جنم کے کشٹ جھیلے ہیں''۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔میرا پہلا جنم اُس وقت ہوا تھا جب انسان نے اس دھرتی پہ گندم کا پہلا دانہ کھایا تھا۔وہ دانہ میں نے ہی اُگایا تھا۔ میں نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن کس قدر حیرت کی

بات ہے کہ میرا نام ان بڑی بڑی مستند کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ کسی مورخ نے بھولے سے بھی میرا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے اُس ظالم انسان کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ جس نے مجھ جیسے لوگوں سے گندم کا آخری دانہ تک چھین لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے بھوک کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا تھا۔

خیر.... میرے دوسرے جنم کا ذکر ضرور ہونا چاہئے تھا۔ اپنے اس جنم میں ایک سنگتراش بنا تھا جو پتھروں کو زندگی بخشتا تھا۔ اُن پتھروں کا ذکر تو ان کتابوں میں ضرور کیا گیا ہے لیکن میرا کوئی معمولی ذکر تک نہیں ملتا، میں نے ایک بادشاہ کے لئے سنگ مرمر سے ایک دوشیزہ تراش لی تھی جس کے سامنے بڑے بڑے بادشاہوں نے اپنا تاج رکھا تھا۔ سپاہی نے اپنی تلوار اور انسان نے اپنا دل اُس کے قدموں میں رکھا تھا۔ اس ڈر سے کہ میں ایسی ہی کوئی دوسری مورتی کسی دوسرے شہنشاہ کے لئے نہ بناؤں۔ بادشاہ نے میرے دونوں ہاتھ کٹوا ڈالے اور آنکھیں نکلوادیں۔ زخموں کی تاب نہ لاکر میں مر گیا۔ وقت کے مورخ نے اُس ظالم بادشاہ کو فن تعمیر کا دلدادہ تو بتایا ہے لیکن مجھے.....!!۔

میرے تیسرے جنم کا حال کسی تاریخ میں درج نہیں۔ اس جنم میں ایک دلیر اور وفادار سپاہی بنا تھا۔ اپنے بادشاہ کی فوج کا ایک وفادار سپاہی۔ وہ زبردست فاتح تھا۔ جہاں اُس کے قدم پڑے تھے وہاں میں نے اپنا خون بہایا تھا۔ بادشاہ ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا ایک خون ریز جنگ میں، میں

نے بادشاہ کی جان بچائی تھی اور اپنی جان دی تھی۔ اس تاریخ میں اُس جنگ کا ذکر تو ہے بادشاہ کی شجاعت کے نغمے تو گائے گئے ہیں لیکن میں کہیں نظر نہیں آتا" جناب میرا قلم"۔

"اپنے چوتھے جنم میں، میں ایک گوّیا بنا تھا۔ ایک غریب گوّیا، گلی گلی، گاؤں گاؤں، شہر شہر بھٹکنے والا، دل کے ٹکڑے میں۔ روح کے ہر گوشے میں آنکھوں سے بہنے والے ہر آنسو میں اپنے کردہ گناہوں کا احساس لے کر اپنے گناہ گار ہونے کا اعتراف کر کے دردر بھٹکتا رہتا۔ ایک مرتبہ میں اسی حالت میں شاہی محل سے گزر رہا تھا۔ محل میں کوئی درباری گوّیا گا رہا تھا۔ اُسکی آواز میں سوز تھا نہ ساز، تڑپ تھی نہ جلن۔ نہ رس تھا نہ مشام اور میری ہر سانس مچل رہی تھی۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ درباری گوّیا اور میں۔ ایک ہی راگ گا رہے تھے یکا یک کھلے آسمان پر گھنگھور گھٹائیں اُمڈ کر آئیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ میں محل کی ڈیوڑھی پر بھیگتا رہا۔ میری آواز آسمانوں سے ٹکرائی، میری روح کا ہر دروازہ کھل گیا اور میں بے اختیار سجدے میں گر پڑا۔ یہی میرا انعام تھا۔ میرے نغمے زبان زد ہو گئے۔ کھیتوں میں کام کرنے والی عورتیں فصل کاٹتے وقت میرے نغمے گانے لگیں لیکن آج میرا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اُس درباری گویے کا ذکر ضرور ملتا ہے جو محض بادشاہ وقت کی خوشنودی کے لئے گایا کرتا تھا۔

"میرا قلم.......!"

"غلامی کی زنجیرین کاٹنے کے لئے میں نے اپنی قوم میں نئی روح پھونک

دی. یہ میرے چالیسویں جنم کا ذکر ہے۔ میں اپنے اس جنم کا ذکر خاص طور سے کر رہا ہوں کیونکہ میں نے مظلوم نہتے عوام کو جینے کا اور آزادی کا نغمہ سکھایا۔ اس خونین انقلاب کی داستان ہر تاریخ کی زینت تو بن گئی ہے لیکن میرا معمولی سا ذکر تک نہیں کیا گیا ہے شاید اس لئے کہ انقلاب کی بہار دیکھنے سے قبل ہی مجھے پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ بغاوت کے الزام میں.......۔

''میرا قلم بنائیے''۔

''نہیں ابھی نہیں تمہیں میرے ہر جنم کا حال سننا ہوگا۔ جس کا ذکر کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتا....''۔

''جناب میرا قلم بنائیے...مجھے آپ کے ہر جنم کا حال معلوم ہے۔ آپ نہ کبھی بادشاہ ہوئے نہ فوجی جرنیل...آپ کبھی کسان بنے ہیں۔۔ کسی جنم میں کان کن۔۔۔ کبھی سنگتراش، کبھی معمار اور کبھی باغی، کسی عام آدمی کا ذکر تاریخ میں کیا گیا ہے جو آپ کا ہوگا؟ میرا قلم بنائیے میں ایک نئی تاریخ لکھوں گا۔ اُس میں آپ کے ہر جنم کا ذکر تفصیل سے ہوگا....''۔

عین اُسی لمحے چھٹی کا گھنٹہ بجا۔ ساتویں جماعت میں تاریخ پڑھانے والے ماسٹر صاحب چونک پڑے۔ اُن کے سامنے تاریخ کی درسی کتابیں تھیں، اُن کے ہاتھ میں ایک قلم اور دوسرے ہاتھ میں قلم تراش...اور سات آٹھ برس کا ایک معصوم بچہ اُن کی طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس میں معصومیت بھی تھی اور علم کی مکاری بھی۔



سب سے بڑا غم

ایک اتوار کی شام کو میں میونسپل پارک کے ایک ویران گوشے میں لیٹا لیٹا کہکشاں کو دیکھ رہا تھا کہ یکا یک کہکشاں میں ایک روشن ہیولا نمودار ہوا... کچھ دیر تک وہ نورانی ہیولا ستاروں کے جُھرمٹ میں چکر لگاتا، پھر اُس نے زمین کی سیدھ باندھی۔ میں نے اضطرابی کیفیت میں کئی بار آنکھیں ملیں۔ شروع میں، میں نے اس نورانی ہیولے کو اپنا وہمہ سمجھا لیکن جب میں نے اس کو اپنے قریب ہوا میں تیرتے ہوئے پایا تو مجھے لگا جیسے میرے ریڑھ کی ہڈی پر برف کی ایک وزنی سل رکھ دی گئی ہو۔ جسم کے ہر حصے میں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ذہن اپنے وجود کے اندر پھیلے ہوئے سناٹے اور اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ اس سے قبل کہ میں مکمل طور پر اپنے آپ سے بچھڑ جاتا۔ میں نے اپنے چاروں طرف ایک بھینی بھینی خوشبو پھیلتی محسوس کی جیسے میرے قریب بے شمار نرگس کے پھول بیک وقت کھل اُٹھے ہوں۔ آنکھیں کھولو نوجوان... ڈرو نہیں... مجھ سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی''۔

آواز اس قدر رسیلی تھی کہ جیسے کس معصوم بچے کے منہ میں ماں کا دودھ زبان بن گئی ہو۔ میری ڈھارس سی بندھ گئی اور روشن ہیولے کی طرف آنکھیں اُٹھا دیں لیکن نور کی بکھری سمٹی کرنوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

''آپ کون ہیں؟''

''ایک فرشتہ..........مجھے خدانے تمہارے پاس بھیج دیا ہے''۔

''فرشتہ...خدا...کہیں میں خواب تونہیں دیکھ رہا ہوں''۔

''نہیں ...میں ایک خاص کام کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں تمہاری دعا منظور کی گئی ہے''۔

''دعا...کونسی دعا''۔

اتنی جلدی بھول گئے ۔یہی تو تم انسانوں میں سب سے بڑی خامی ہے۔مانگنے کا کوئی سلیقہ نہیں ۔اس لئے تمناؤں کے جال میں پھنس کر بے بس مچھلیوں کی طرح تڑپتے ہو۔تم سمجھتے ہو کہ تمہاری دعائیں خلاؤں میں بھٹکتی رہتی ہیں وہ خدا تک نہیں پہنچتی ہیں لیکن تمہاری ہر دعا خدا تک پہنچتی ہے ۔اس پر غور وخوض کیا جاتا ہے اور اگر دعا صحیح طریقے سے مانگی گئی ہو اور وہ تمہارے حق میں ہو تو تمہاری دعا قبول کی جاتی ہے لیکن اگر غلط قسم کی دعائیں مانگی جائیں تو ان پر غور نہیں ہوتا۔معقول اور جائز قسم کی دعاؤں پر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر ابھی تھوڑی دیر قبل تم نے جو دعا مانگی تھی جو تمہیں اب یاد نہیں وہ قبول کی گئی ہے اور مجھے اس سلسلے میں تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔تھوڑی دیر پہلے سگریٹ کا ایک بھرپور کش لے کر تمہارے منہ سے جو الفاظ نکلے تھے میں انہیں دُہراتا ہوں۔

''اُف ...اُف میرے خدا،،کب تک میں تمہاری اس دنیا میں اس طرح بے بس ،لاچار اور مجبور ہو کر جیوں گا۔کیا میرے نصیب میں تم نے دکھوں اور مصیبتوں کے سوا کچھ اور نہیں لکھا ہے..میں معمولی خوشیوں کیلئے ترستا رہا ہوں

بوڑھے ماں باپ نے ہمارے لئے بڑے دُکھ جھیلے ہیں، انہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی، یہ سب کچھ کر کے میں اُن کے دکھوں کا مداوا بنوں گا لیکن میں پچھلے تین برس سے بے کار بیٹھا ہوں۔

میری نوجوان بہنیں مہندی کے لئے ترس رہی ہیں۔ مالک تمہاری اس دنیا میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں تمہاری اس دنیا میں بہت دنوں تک جینا نہیں چاہتا۔ مالک اگر تم نے میری زندگی ساٹھ ستّر برس کی رکھی ہے تو اُس میں سے دس بیس سال کاٹ لے۔ صرف دس برس اور جینے دے لیکن زندگی کے یہ دس برس خوشی، سکون اور آرام سے کٹیں تو اتنا ہی کافی ہے۔۔ مالک، مالک'' اور اس کے بعد تم سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے گھاس پر مسل کر بمبئی پہنچ گئے تھے''۔

''بمبئی''۔

'ہاں بمبئی... کسی ایشور یہ رائے کے بیڈ روم میں .... لیکن تمہاری دعا پر اتنی ہی دیر میں عرش پر غور ہو چکا تھا اور تمہاری دعا منظور ہوئی''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا''۔

''بات سیدھی اور واضح ہے تمہیں اس دنیا میں پورے ستر برس جینا تھا یعنی مزید چالیس برس اور تمہارے یہ چالیس برس ایک عام غریب آدمی کی طرح گزرتے لیکن تمہاری دعا کے مطابق اب تمہاری زندگی سے تیس برس کاٹ دئے گئے ہیں اور تمہیں اب صرف دس برس جینا ہوگا۔ ان برسوں میں تمہیں ہر خوشی ملے گی۔ تمہاری زندگی کے یہ دس برس نہایت اطمینان، سکون اور آرام

سے گزریں گے۔ جس چیز کی تم خواہش کرو گے اور جس چیز سے تمہیں مسرت ملے گی وہ تمہیں مہیا کی جائے گی۔ کوئی غم، کوئی پریشانی تمہیں چھو کر نہیں گزرے گی۔ ہر قسم کے وسوسوں سے تمہیں چھٹکارا ملے گا اور ٹھیک دس برس کے بعد تمہیں اپنے وعدے کے مطابق اپنے آپ کو موت کے فرشتے کے حوالے کرنا ہوگا، بولو تمہیں یہ شرائط منظور ہیں؟''

''شرائط!''۔

''ہاں.. جب تمہاری دعا پہ عرش پر غور کیا جا رہا تھا تو تمہاری دعا مکمل طور پر قبول کرنے سے قبل تمہاری مانگی ہوئی دعا ایک بار پھر تمہارے سامنے رکھنے کا مشورہ دیا گیا تھا تا کہ فریقین میں ایک باضابطہ معاہدہ ہوں۔ تم چونکہ دنیا کے پہلے شخص ہو جس نے یہ عجیب وغریب دعا مانگی ہے لہذا اس قسم کا معاہدہ ضروری ہے۔ اگر تمہیں یہ شرائط منظور ہوں تو اس کاغذ پر دستخط کرلو''۔

ایک نورانی کاغذ جس میں سے وہی نرگس کے پھولوں جیسی خوشبو آرہی تھی میری طرف تیرتا ہوا آیا۔ ہاتھوں میں لے کر میں نے پڑھنا شروع کیا۔

''میں علی اکبر ولد جمیل اکبر ساکنہ ذالڈگر بہ ہوش حواس اپنی مرضی سے ستر سالہ زندگی سے پورے تیس برس واپس لوٹا رہا ہوں۔ جس کے نتیجے میں اب مجھے صرف دس برس کیلئے جینا ہوگا لیکن ان دس برسوں میں کوئی معمولی سا غم یا پریشانی مجھے چھو کر بھی نہ گزریگی۔

نوٹ: مسمی علی اکبر کو خوشی، راحت، مسرت اور سکون کا معیار اپنے مزاج اور اپنی سوچ کے مطابق طے کرنا ہوگا۔

عبارت پڑھ کر میں نے استفہامیہ نظروں سے نورانی ہیولے کی طرف دیکھا لیکن رقصاں قوس قزح کے سوا کچھ اور نظر نہ آیا۔

''جناب.. عبارت کے آخر میں جو نوٹ ہے اُس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا ہے''۔

''یہ بات بالکل واضح ہے۔ تمہیں اپنے لئے خوشی، راحت، مسرت اور سکون کا معیار اپنے مزاج اور اپنی سوچ کے مطابق طے کرنا ہوگا''۔

''کیا خوشی، راحت اور سکون کا معیار الگ الگ ہوتا ہے''۔

''بیشک.. غم اور خوشیاں نسان کا انفرادی مسئلہ ہے۔ ایک بچہ اپنا من پسند کھلونا پا کر خوش تو ہوسکتا ہے لیکن وہ اس کو سنبھال کے نہیں رکھتا بلکہ خود اپنے ہاتھ سے اسے توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح بھی اسے راحت ملتی ہے لیکن اس کے برعکس ایک بالغ شخص کو اپنی من پسند چیز ملے تو وہ اُسے سنبھال کے رکھتا ہے۔ تمہاری خوشیاں کیا ہونگیں، تمہیں کن باتوں سے راحت مل سکتی ہے، یہ تمہارا اپنا کام ہوگا، اگر تمہیں یہ شرائط منظور ہو تو...''۔

یکا یک نورانی ہیولے سے آواز آنا بند ہوئی، مجھے ایسا لگا جیسے وہ کچھ سننے کیلئے رکا ہو۔ کچھ دیر تک ہیولا ساکت و خاموش کھڑا رہا، پھر وہی گلابی، کومل شگوفوں میں سرسراتی ہوئی لطیف ہوا کے جھونکوں کی طرح آواز سنائی دی۔

''تمہیں ایک رعایت دی گئی ہے۔ ابھی اوپر سے احکامات صادر ہوئے ہیں کہ معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے تمہاری دس سالہ زندگی کا ایک خاکہ دیا جائے.. اپنی آنکھیں بند کرلو''۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دوسرے ہی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا

جیسے میں سنہری بادلوں کے اوپر تیر رہا ہوں ۔عجیب سی فضا تھی ،رنگ و نکہت میں ڈوبی ہوئی۔جیسے جنت کے کھلے دریچوں کے نزدیک لا کھڑا کر دیا گیا ہو۔دفعتاً میرے سامنے ایک سفید ریشمی پردہ لہرایا اور اُس پر سنیما کے پردے کی طرح منظر بدلنے لگا۔پہلے ایک عالیشان کوٹھی نظر آئی جس کے وسیع لان میں ایک شامیانہ لگا ہوا تھا،میری بہنوں کی شادی ہو رہی تھی۔میرے بوڑھے ماں باپ اعلیٰ قسم کے کپڑے زیب تن کئے ہوئے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے ۔پھر منظر بدلا۔ایک وسیع ہال میں ایک چیرمین کی کرسی پر بیٹھا ہوا میں اپنی کمپنی کے حصہ داروں کے ساتھ اپنے کاروبار کی سالانہ رپورٹ سن رہا تھا۔کروڑوں روپیوں کا منافع۔پھر منظر پہ منظر بدلنے لگا۔خوشیاں ہی خوشیاں ۔میرے خواب ایک ایک کر کے میرے سامنے آ رہے تھے۔عزت ،دولت ،شہرت سب کچھ تھا۔ایک بار پھر میری کوٹھی کا منظر سامنے آ گیا۔میرے نوسالہ بیٹے کا جشن سالگرہ منایا جا رہا تھا۔ایک بے حد حسین اور پُر وقار عورت میری بیوی کے روپ میں مسکراہٹوں کے پھول بکھیر رہی تھی اور میں اپنے معصوم بچے کو گود میں لئے ہوئے اپنے بچے کے دوستوں میں تحفے تقسیم کر رہا تھا۔پھر یکا یک اندھیرا چھا گیا جیسے دنیا کی تمام روشنیاں بجھا دی گئی ہوں جیسے سورج کو کسی بھیانک اژدھے نے نگل ڈالا ہو۔کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ’’تمہاری زندگی کے آخری لمحات آ گئے ہیں ۔دس برس پورے ہو چکے ہیں ۔چلنے کیلئے تیار ہو جاؤ‘‘ ’’لیکن ..آج اس وقت میرے گھر میں میرے

بیٹے کی سالگرہ کا جشن منایا جا رہا ہے۔۔مجھ سے وعدہ خلافی ہوئی ہے"۔

"کیا تم نہ یہ دس برس اپنی مرضی، اپنی خوشی سے نہیں گزارے ہیں۔ کیا تمہیں ہر خوشی، ہر مسرت اور ہر راحت نہیں ملی۔ کیا تمہیں آج تک کسی معمولی غم نے چھوا ہے"؟

"غم .... گزشتہ دس برس میں نے جس غم میں گزارے ہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا"۔

"جھوٹ۔۔سراسر جھوٹ۔۔۔تمہاری ایک بھی نہیں چلے گی۔تم معاہدے کے پابند ہو............ چلو"۔

میرا ایک ایک پل غم اور پریشانی میں گزرا ہے۔ مجھے ہر وقت یہ دھڑکا رہتا تھا کہ مجھے صرف دس برس کے بعد مرنا ہے۔ ہر گزرتے ہوئے سیکنڈ نے مجھے احساس دلایا کہ دس برس میں ایک سیکنڈ کم ہوا ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں چلونگا۔ مجھے یہ زندگی منظور نہیں ...میں غریب، مصیبت کا مارا ہوا پریشان حال جینا چاہتا ہوں......میں جینا چاہتا ہوں۔

غریب، مفلس، لاچار، نادار....

مجھے صرف ایک وقت کی روٹی ملے۔۔میرے بچوں کو پینے کیلئے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہ ملے... مجھے یہ بھی منظور ہے۔...

آج میرے بیٹے کی نویں سالگرہ ہے....

میں ابھی چالیس برس کا ہوں....

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔



پنڈورا کی نئی کہانی

1

پنڈورا اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ اُن کا گھر ایک ندی کے کنارے پر تھا۔ ندی کا رنگ نیلا تھا۔ اس کے فرش میں سفید سفید گول پتھر تھے۔ اُس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیرا کرتی تھیں۔ گھر کے سامنے شاہ بلوط کا ایک پُرانا پیڑ تھا جس پر نیلی چڑیوں نے اپنے گھونسلے بنائے تھے۔

پنڈورا اپنے بھائی سے دو سال بڑی تھی۔ اُس کا رنگ گورا بے حد گورا تھا۔ زعفران اور سفید گلابوں کا ایک دل رُبا امتزاج، چہرے پر ایک پاکیزہ معصومیت جیسے گل لالہ مسکرا رہے ہوں، اخروٹ کی رنگت لئے ہوئے ریشمی بال۔ پنڈورا اپنے چھوٹے بھائی سے بے حد محبت کرتی تھی۔ اُس کے لئے جنگل سے تازہ شہد لے کر آتی تھی، ہلکی ہلکی برف باری میں اُسے لوری سُنا کر سلاتی...... برف پگھل جائے گی، جاڑا بیت جائے گا اور بہار آئے گی اور اس کا بھائی سو جاتا۔

پنڈورا خوش تھی بہت خوش۔ وہ جب وادی کے پھول چُنتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کا وجود ہلکا پھلکا ہو کر بادلوں کے اوپر تیر رہا ہو...... وادی میں میٹھے پھلوں کی کوئی کمی نہ تھی لال اور پیلے سیب، سبز بنفشی دونوں رنگ کے آلوچے، سبز اور پیلے دونوں قسم کی ناشپاتیاں اور وادی میں بے شمار تتلیاں

اُڑتی تھیں۔ صندلی، طاوسی، اودھی، نیلی پیلی۔ دونوں بہن بھائی خوش تھے۔ نہ کبھی سر میں درد ہوتا تھا نہ سینے سے درد کی لہر اُٹھتی تھی۔ نہ اُنہیں چوٹ لگتی تھی نہ کوئی کیڑا کاٹتا تھا۔

پنڈورا کے پاس ایک گڑیا تھی جو اس کی ماں نے اُس کے لئے بنائی تھی۔ گڑیا کی آنکھوں کا رنگ بالکل گھر کے سامنے بہنے والی ندی جیسا تھا۔ وہ گھنٹوں گڑیا کو کہانیاں سنایا کرتی تھی، بادلوں کے محل سے آئے ہوئے راجکمار کی۔ پنڈورا کے پاس اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا ایک صندوقچہ تھا جسے اُس کے پاپا نے اُس کے لئے بنایا تھا۔ اُس نے پنڈورا سے کہا تھا ''بیٹی اس صندوقچہ کو کبھی نہ کھولنا۔ جس دِن تم اسے کھولو گی تمہاری آنکھوں سے نمکین پانی کی جھڑی لگ جائے گی۔ تمہیں بے حد تکلیف ہوگی۔ جب تک یہ بند رہے گا تمہارے سر میں کبھی درد نہ ہوگا۔ کبھی سینے سے درد کی لہر نہ اُٹھے گی۔

شام کو سونے سے پہلے پنڈورا پاپا کا چہرہ اپنی آنکھوں کے سامنے لائی ''پاپا میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں......!'' پھر وہ سو جاتی اور تتلیوں کے پیچھے دوڑتی۔ پنڈورا کا بھائی بڑا اچھا لڑکا تھا۔ اپنی بہن کا بڑا خیال رکھتا تھا لیکن کبھی کبھی پنڈورا سے صندوقچہ کھولنے کی بات کرتی۔ پنڈورا سختی سے منع کرتی تھی۔ ایک دن اُس کے بھائی نے اُسے بہت مجبور کیا۔ اُس نے پنڈورا سے کہا کہ اگر اُس نے صندوقچہ نہیں کھولا وہ اُسے چھوڑ کر پہاڑوں کے اُس پار چلا جائے گا۔ پنڈورا بہت روئی۔ وہ اپنے بھائی کی جدائی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اُس نے بھائی کے سامنے بکس کھولا...... یکا یک پنڈورا کو سر درد کا احساس ہوا۔

سینے سے دَرد کی لہر اُٹھتی، بے حد دَرد محسوس ہوا۔تب اُس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔اُس نے زبان سے چکھ لیا وہ نمکین پانی تھا۔پھر دونوں بہن بھائیوں کو یکا یک ایسا لگا جیسے اُن کے دل میں غم نے ڈیرا ڈال دیا ہو۔

2

وہ چورلڑکا آج ایک مرتبہ پھر شہر میں نظر آیا تھا اور یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی......!

دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی تمام دُکانیں بند ہو گئیں۔سکولوں اور کالجوں سے طالب علم باہر آ گئے۔کارخانے بند ہو گئے، دوڑتے، چیختے، مشتعل اور متنفر لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے لئے جہاں سے گزرتے وہاں کا سکون درہم برہم ہو جاتا۔دُکانوں کے شٹر گرنے لگتے، ماحول کا سکون غارت ہو جاتا۔لوگوں میں بھگدڑ مچ جاتی اور زبانوں پر ''کہاں ہے...... کہاں ہے؟......'' آ جاتا شہر کا ایک ایک آدمی اُس چورلڑکے کو تلاش کرنے میں لگ گیا۔

لاؤڈ سپیکر گونج رہے تھے۔چورلڑکے کا حلیہ بار بار بتایا جا رہا تھا۔

''رنگ گورا، بے حد گورا، زعفران اور سفید گلابوں کا ایک دِلربا امتزاج۔ چہرے پر ایک پاکیزہ معصومیت جیسے گلِ لالہ مسکرا رہے ہوں۔اخروٹ کی رنگت لئے ہوئے لمبے ریشمی بال......جسم پر چیتھڑے، ننگے پاؤں جو جگہ جگہ زخمی ہو چکے ہیں اور زخموں سے خون رس رہا ہے، گلابی رنگت لئے ہوئے...... عمر دس گیارہ سال......بغل میں ایک پوٹلی دبائے۔آپ کو جہاں کہیں بھی اس

حلیے کا لڑکا نظر آئے اُسے پکڑ لیجئے۔ وہ ایک خطرناک چور ہے۔ اُسے آج تک ہمارے شہر کی پولیس پکڑنے میں ناکام رہی ہے۔ شہر کا کونہ کونہ چھان مارو......آج وہ ضرور پکڑا جائے گا''

یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ بڑا ہوشیار اور چکمہ باز تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ دن دھاڑے گھروں اور دکانوں، کارخانوں اور دفتروں، سکولوں اور کالجوں میں چوری کرنے کیلئے داخل ہو جاتا تھا لیکن جیسے ہی اُس کو پکڑنے کی کوشش کی جاتی وہ کسی چھلاوے کی مانند غائب ہو جاتا اور پولیس والے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے!

پولیس کی پے در پے ناکامیوں نے لوگوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی خفیہ ایجنٹ ہے، دُشمن ملک کا جاسوس ہے۔ جو ہماری ایٹمی تنصیبات کے متعلق معلومات جمع کر رہا ہے۔ شہر کے لوگ آج ایک منظم طریقے سے اُسے کھوج رہے تھے۔ لوگ گروہوں میں بٹ کر اُسے ہر گلی میں تلاش کر رہے تھے لیکن اُس کا پکڑا جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔

جیسے جیسے وقت گذرتا چلا جا رہا تھا وہ چمک۔ مانند پڑتی جا رہی تھی جو صبح لوگوں کی آنکھوں میں اُس وقت عود کر آئی تھی جب اُنہوں نے چور لڑکے کے نظر آنے کی خبر سُنی تھی۔ اور پھر جب شام کے سرمئی دھندلکوں نے شہر کو گھیرنا شروع کیا تو کچھ لوگ جن میں زیادہ تر بوڑھے لوگ تھے، گھروں کا رُخ کرنے لگے لیکن نوجوان اور بچے اب بھی پرامید تھے اور اُسی جوش کے ساتھ چور لڑکے کو تلاش کر رہے تھے۔ یکا یک شہر کے جنوبی حصّے سے زبردست شور

وغل سنائی دینے لگا۔ ''ارے وہ رہا......وہ دیکھو......سمندر کی طرف بھاگ رہا ہے......''

''پکڑو۔ پکڑو۔ جانے نہ پائے......''

لوگ شہر کے جنوبی حصّے کی طرف بے تحاشا دوڑنے لگے۔ چور کو تین اطراف سے گھیرا جا چکا تھا۔ پیچھے سمندر تھا، جو ابھی ابھی سمندر کی تہہ میں ڈوب چکا تھا اور مغربی اُفق پر لاکھوں گل لالہ کھل اُٹھے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصّے میں شفق کی لالہ گوں لہریں غائب ہوگئیں اور رات کی سیاہ چادر پر تاروں کی افشاں چُن دی گئی۔ وہ سہما سہما سا ساحل پر دوڑتا پھر رہا تھا۔ اپنے تینوں طرف لوگوں کو بڑھتے دیکھ کر وہ سمندر کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

''کیا وہ سمندر میں......!!''

''نہیں اُس کو ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا......!''

''دوڑو......پکڑو......''

ٹھیک اُس لمحے جب اُس نے لوگوں کو پوری رفتار کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا تو اُس نے ایک ہاتھ ہوا میں بلند کیا:

''رُک جاؤ......!''

لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے جاگ پڑا ہو وہ آواز سچ مچ اتنی ہی حیرت انگیز تھی۔ بلند مگر صاف جیسے سمندر میں لاکھوں ایمپلی فائر لگا دیئے گئے ہوں۔ سب کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔

''ٹھہرو...... میں چور نہیں ہوں...... میری طرف مت آؤ...... مجھے جانے دو......''

''آج ہم تمہیں پکڑ کر ہی دم لیں گے۔ تم نے ہمیں بیحد پریشان کر رکھا ہے، آج ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے......''

''مجھے جانے دو...... میں چور نہیں ہوں۔ میں نے تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑا ہے...... خدا کیلئے مجھے جانے دو......''

''تم چور ہو......''

''نہیں میں چور نہیں ہوں......''

''تم ہمارے گھروں میں گھس کر کیا کرتے تھے اور تمہاری اس پوٹلی میں کیا ہے......؟''

''میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے چھوڑ دو...... میں چور نہیں۔ میں نے تمہارا کچھ بھی نہیں چُرایا ہے'' وہ اپنی پوٹلی پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا.

''اپنی اس پوٹلی کو کھول دو۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم نے ہماری کیا کیا چیزیں چُرائی ہیں......''

''میں نے تمہارا کچھ بھی نہیں چُرایا ہے......

''پھر تمہاری پوٹلی میں کیا ہے؟''

''اس میں...... نہیں نہیں میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتا......''

''پکڑو...... دوڑو...... پکڑو چھین لو اس سے یہ پوٹلی......'' کئی نوجوان چیخ کر بولے

''ٹھہرو...... میرے قریب نہ آؤ...... اس پوٹلی کو مت کھولو...... تم مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے......''۔

''ہم پہلے ہی مصیبتوں میں گرفتار ہیں!......''۔

''لیکن یہ نئی مصیبتیں ہیں...... تباہ کن ...... یہ مصیبتیں تمہیں ختم کر دیں گی۔ نیست و نابود کر دیں گے......''۔

''ہم اپنی مصیبتوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ اپنی پوٹلی کھولو...... ورنہ ہم تمہیں سمندر میں پھینک دیں گے......!''۔

''خدا کے لئے مجھے مجبور نہ کرو......''۔

''کھولو...... پوٹلی کھولو...... ہزاروں لوگ ایک ساتھ دہاڑے......

اُس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا جیسے اُن میں برف پگھل رہی ہو۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ پوٹلی کی گرہیں کھولنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے چاروں طرف ایک تیز قسم کی بو پھیلنے لگی۔ پھر وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا......!!

''میں چور نہیں ...... میں اس پوٹلی میں وہ تمام نفرتیں سمیٹتا چلا آ رہا ہوں جو آج تک دنیا میں پھیلی ہیں...... اس پوٹلی میں زندگی کی سب نفرتیں بند ہیں...... بارود کی بو ہے۔ انسان کے خون کی بو ہے، اُسی نفرت کی بو ہے جو انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کیخلاف موجود ہے۔ ہاں نفرت کی بو...... محبت تو خوشبو ہے، زندگی کی خوشبو ہے، پیاری پیاری دلآویز خوشبو...... اس پوٹلی میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے تمام آنسو

بند ہیں۔ میں شہر شہر گاؤں گاؤں، گلی گلی پھرتا رہتا ہوں اور دُنیا کی ساری نفرتیں لوگوں کے دلوں سے نکال کر جمع کرتا رہتا ہوں...... مجھے نہ مارو...... یہ پوٹلی نہ کھولو...... اگر یہ پوٹلی کھولی گئی تو دُنیا میں اور بھی زیادہ نفرت پھیلے گی اور جب نفرت پھیلے گی تو گل لالہ کھلنا بھول جائیں گے۔ کوئی پھول مہکے گا نہیں...... اور انسان پھولوں کی مہک سے زندہ ہے......"

"ارے۔ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے!......"

"چور کی اولاد......"

"دوڑو۔ پکڑو......"

لڑکا سمندر کی طرف دوڑ پڑا۔ پوٹلی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اُس نے پوٹلی کو اُٹھانا چاہا لوگ اُس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اُس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ لوگ پوٹلی پر جھپٹ پڑے۔

دوسرے ہی لمحے زبردست اندھیرا چھا گیا۔ زبردست دھماکے ہونے لگے۔ زمین لرزنے لگی اور سمندر لاوا اُبلنے لگا دُنیا میں تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تھی......!!



لاتعلق

یک دن موسیٰ ایک دریا سے گزر رہے تھے۔ بہت سارے لڑکے دریا میں نہا رہے تھے، ایک اپاہج لڑکا کنارے پر بیٹھا انہیں حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ موسیٰؑ کو بڑا افسوس ہوا، شام کو طور پر جا کر خُدا سے شکایت کی۔ خُدا مسکرا پڑا لیکن بولا کچھ نہیں۔ کہتے ہیں کہ خُدا زیادہ بولتا نہیں، وہ کہتا ہے ''ہوجا'' اور جو کچھ بھی ہونا ہے ہو جاتا ہے، دوسرے دن موسیٰؑ پھر اُسی دریا سے گزرے، دیکھا کہ لڑکے دریا میں نہا رہے ہیں لیکن کل والا اپاہج لڑکا نظر نہ آیا۔ تب اچانک لڑکوں کو پانی میں ڈوبتے دیکھا۔ لڑکے ایک ایک کر کے ڈوبتے رہے۔ یہاں تک کہ سب لڑکے ڈوب گئے اور انہیں ڈبو دینے والا وہی اپاہج لڑکا تھا، لیکن آج وہ اپاہج نہیں تھا۔

''لکھو...... کہ ایک لڑکا، نو دس برس کا، سفید نکر اور سفید قمیض پہنے......ریشمی بالوں والا...... گلے میں بستہ ڈالے اچانک گلی سے نمودار ہوا۔ عین اسی لمحے ایک تیز رفتار ماروتی کار، بلائنڈ کارنر سے نمودار ہوئی اور لڑکا اُس کی زد میں آ گیا۔ لڑکے کا سر پھٹ گیا۔ کار سامنے کے کھمبے سے ٹکرا گئی اور ڈرائیور نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا۔''

''غلطی لڑکے کی تھی......''

''ہم حادثے کی روائیداد لکھ رہے ہیں۔ غلطی کس کی تھی، یہ دیکھنا ہمارا کام

نہیں یہ بتاؤ کہ گاڑی کو آگ کس نے لگائی تھی......؟

''جو لوگ سڑک پر تھے......''۔

''ان میں تم بھی تھے''۔

''نہیں میں اس وقت آ گیا تھا جب کار کو نذرِ آتش کیا جا چُکا تھا''۔

''کار نمبر''۔

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ایک بڑی غلطی کا احساس ہوا۔

''لڑکا کتنی دیر تک سڑک پر زخمی حالت میں پڑا رہا؟''

''جب تک پولیس آئی......''۔

''اور پولیس کب آئی؟''

''حادثے کے ایک گھنٹہ بعد''۔

''ایک گھنٹہ تک وہ زخمی حالت میں پڑا رہا۔کسی نے اسے اسپتال پہنچانے کی کوشش نہ کی ممکن تھا کہ بروقت طبی امداد ملنے پر بچ جاتا......''۔

''دیکھئے جناب، حادثے کے وقت میں یہاں موجود نہیں تھا......!''

''اور میں بھی نہیں......!''

''اور میں بھی نہیں......!''

''اور میں بھی نہیں......!''

''تم سب لوگوں میں حادثے کے وقت یہاں کوئی موجود نہ تھا''

اُن لوگوں کے ساتھ میں نے بھی نفی میں سر ہلایا...... اچانک مجھے

زبردست پیاس کا احساس ہوا۔ جیسے میں اَزل سے ہی پیاسا ہوں، میں حادثے کے وقت جائے واردات پر موجود تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے سُرخ ماروتی کو بلائنڈ کارنر سے نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

''اور وہ معصوم ایک گھنٹے تک سڑک پر زخمی حالت میں پڑا رہا......!''

''جناب قصور سارا میونسپل کارپوریشن کا ہے۔ شہر کے اس گنجان آباد علاقے میں اس جگہ بلائنڈ کارنر کا موجود ہونا اس محکمے کی نا اہلیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔''

''لیکن......وہ معصوم ایک گھنٹے تک''۔

''ایسا ہرگز نہ ہوا ہوتا جناب ...... دراصل یہ احساس فرض کی بات ہے۔ محکمہ ٹریفک کنٹرول کی طرف سے اس جگہ ایک ٹریفک کانسٹیبل تعینات کیا جاتا تو یہ حادثہ رونما نہ ہوا ہوتا۔ یہ محکمہ فضول ہے۔ اس محکمے کے اہلکاروں میں ذرا بھی احساسِ فرض ہوتا تو شہر کی سڑکوں پر اس طرح کے دِلدوز حادثے آئے دن رونما نہ ہوا کرتے''۔

''ایک گھنٹے تک وہ زخمی حالت میں پڑا رہا۔ اس کے سر سے خون بہتا رہا۔ اور آپ میں سے کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اسے اسپتال پہنچا دیتا''۔

''جناب۔ ہماری تقدیروں کے مالک وہ لوگ بن بیٹھے ہیں جو صرف اپنی تجوَریاں بھرنے کی فکر میں ہیں۔ شہر کی تنگ سڑکوں کو کشادہ کرنے کے لمبے چوڑے دعوے ہم ہر الیکشن میں سنتے ہیں۔ لیکن الیکشن ہوتے ہیں وہ ہمیں بھول جاتے ہیں اور شہر کی تنگ و تاریک سڑکوں کو بھی۔ دراصل ہماری پلاننگ

مشینری غلط ہے۔ اس کے کل پرزوں میں نا اہلیت اور نا قابلیت کا روک لگ گیا ہے۔ جہاں بدعنوانی کا راج ہو، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو، وہاں اس طرح کے دلدوز حادثوں کا رونما ہونا قدرتی بات ہے۔ شہر کی سڑکیں کشادہ کی جاتیں، ان کی مرمت وقت پر کی جاتی تو اس قسم کے حادثے ہونے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔

''کاش۔ کوئی اس معصوم کو اسپتال پہنچا دیتا۔''

نام۔ فاروق منیر، باپ کا نام۔ منیر احمد...... جماعت چہارم...... سکول کا نام...... نیو چوپ انگلش میڈیم سکول۔ سبجکٹ: ماحول کے ذریعے تعلیم......''

''چلئے شکر ہے...... ورنہ اس کی شناخت بھی مشکل بن جاتی......''۔

مجھے ایک مرتبہ پھر شدید پیاس کا احساس ہوا جیسے میں اَزل سے پیاسا ہوں۔ میں نے ڈرائیور کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے پیچھے دوڑ لگائی تھی۔ میں نے ایک گری ہوئی دیوار کے پیچھے اُسے دبوچ لیا تھا۔

''حرام زادے، تم اس طرح ایک معصوم کا خون کر کے بھاگ نہیں سکتے۔''

''میرا کوئی قصور نہیں وہ خود ہی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا......''

''پھر تم بھاگ کیوں کھڑے ہوئے۔ ممکن ہے کہ وہ زندہ ہو۔ چلو اسے اسپتال پہنچا دو''۔

''نہیں لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔''

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''تب وہ رُک گیا۔اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''میرے پاس اس وقت یہ دس ہزار ہیں۔تم مجھے جانے دو۔میں اور دس ہزار دوں گا۔''

اچانک مجھے شدید پیاس کا احساس ہوا جیسے میں اَزل سے پیاسا ہوں۔

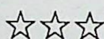
''میں کل اور دس ہزار دوں گا۔''

''دس ہزار''

''ہاں......''

یک بیک اُس کی حالت سُدھر گئی۔جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔اُس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔کوٹ کی سلوٹیں دُرست کیں،تب مجھ سے بولا۔

ہاں دس ہزار ملیں گے۔جاؤ میری گاڑی میں آگ لگاؤ،اور سُنو،نمبر پلیٹ کا نام ونشان بھی کہیں نظر نہ آنا چاہئے۔



چھوٹا آدمی

ہر چھوٹے آدمی کی طرح گُل محمد جیسے چھوٹے آدمی نے بھی ایک چھوٹی سی بات سوچ لی۔ ''ہر بڑا آدمی میرے صاحب کی طرح بُرا آدمی ہوتا ہے'' یہ سوچ کر اُس نے آتش دان کے قریب بیٹھی ہوئی میم صاحب کی طرف اپنی نظریں اُٹھادیں۔ آتش دان میں سُلگنے والی لکڑیاں بار بار چیخ نہ رہی ہوتیں تو سونہ مرگ کے فارسٹ ریسٹ ہاوس کے اس آرام دہ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوتی۔

''اگر کل بھی رستہ نہ کھلا تو؟......'' میم صاحب کے گلابی ہونٹوں میں جنبش ہوئی لیکن گل محمد اب بھی خاموش رہا۔ میم صاحب نے ایک بار پھر گہری نظر کھڑکی کے قریب کھڑے نوجوان گل محمد پر ڈال دی۔ لمبا تڑنگا، کسی بھوکے شیر کی طرح چوکنا، بڑی بڑی ہڈیاں، کُھلے کُھلے ہاتھ پاوں، خاکی رنگ کی قمیض، کھلے کالر سے اُبھری ہوئی مضبوط اُونچی گردن، کُشادہ پیشانی پر بکھرے ہوئے بال، گھنے ابرؤوں کے نیچے لمبی سیاہ لکیریں، میم صاحب نے اس طرح کی لمبی آنکھوں والوں کو بہت کم دیکھا تھا۔

''گل محمد'' آتش دان میں سلگتی لکڑی بڑے زور سے چیخی۔

''جی میم صاحب''۔

''اگر کل بھی رستہ نہ کھلا تو......؟''

''کیا کریں میم صاحب، اب تو پیچھے کا بھی رستہ بند ہو چکا ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کل تک راستہ کھل جائیگا۔ برف باری بھی بند ہو چکی ہے''۔

''واقعی!'' میم صاحب کا چہرہ کِھل اُٹھا، وہ تقریباً دوڑتے ہوئے قدموں سے کھڑکی تک آگئی اور اپنی گوری، ملایم مخروطی اُنگلیاں شیشوں پر پھیرنے لگی۔ گل محمد ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن اسکے باوجود میم صاحب کے جسم سے پھوٹنے والی مسحور کُن خوشبو اُسکے نتھنوں میں داخل ہوتی رہی۔ گل محمد اب کی بار بھی اپنی سانسوں پر قابو نہ رکھ سکا۔

''ارے ہاں، برف گرنا بند ہوگئی ہے'' میم صاحب نے مڑتے ہوئے کہا۔ گل محمد اُسکے عین سامنے تھا، خاموش کسی مضبوط چٹان کی مانند۔ گھنی ابروں کے نیچے سیاہ لکیریں کچھ زیادہ ہی پھیل گئی تھیں۔ آتش دان میں پڑی ایک اور لکڑی زور سے نہ چٹختی تو نہ جانے کب تک وہ دونوں ایک دوسرے کو اسی طرح عجیب نظروں سے دیکھتے رہتے۔ گل محمد نے ایک دم سے اپنی نظریں جھکالیں شاید یہ سوچ کر کہ وہ ایک چھوٹا آدمی ہے۔ سامنے کھڑی عورت کے شوہر کا سرکاری ڈرائیور۔ اُس نے جب اپنی آنکھیں پھر اُٹھائیں تو میم صاحبہ آتشدان کی طرف جا رہی تھی۔ آتش دان کے اُوپر منقش محراب کے نیچے شمع کی لو پھڑ پھڑا رہی تھی۔

''گل محمد! تم کب سے صاحب کے ساتھ ہو؟''

''پچھلے چھ ماہ سے میم صاحب'' گل محمد کو اپنے خشک ہوتے ہوئے گلے

کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔

''شادی کب ہوئی تھی تمہاری؟''

''چار ماہ قبل''۔

''بیوی کو اکیلا چھوڑ کے آئے ہو؟''

''نن۔۔نن۔۔نہیں۔وہ صاحب کے پاس۔۔۔

''میم صاحب کے ہونٹوں پر ایک حسین سی مسکراہٹ معنی خیز انداز سے پھیل گئی اور گل محمد نے ایک چھوٹی سی بات سوچ لی'' ہر بڑا آدمی میرے صاحب کی طرح بُرا ہوتا ہے''

''تمہاری بیوی کا نام کیا ہے۔خوبصورت سا نام ہوگا اور خود بھی خوبصورت ہوگی ،تم لوگ جتنے خوبصورت ہوتے ہو اسی قدر تمہارے نام بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔کیا نام ہے تمہاری بیوی کا......؟''

''شہناز''۔

''شہناز......میں نے کہا تھا نا کہ خوبصورت نام ہوگا اور یقیناً خوبصورت ہوگی لیکن کتنی بدنصیب۔اس حسین رات میں اکیلی ہوگی ......لیکن نہیں ......تمہارے صاحب......''

'' میم صاحب ۔آپ آرام کیجئے میں دوسرے کمرے میں جاتا ہوں ۔دروازہ اندر سے بند کر دیجئے، اور سونے سے پہلے موم بتی بُجھا دیجئے۔یہ عمارت لکڑی کی ہے۔''

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا تھا۔اُسی تیزی کے ساتھ دوسرے کمرے

میں داخل ہوا اور اپنے بستر پر بیٹھ کر ہر چھوٹے آدمی کی طرح چھوٹی اور بڑی باتیں سوچنے لگا، ایسی باتیں جو ذہن کے دروازے پر بار بار دستک دیتی ہیں اور روح کے دریچوں پر کنکریوں کی طرح برستی ہیں، جو انسان کو سونے نہیں دیتیں، جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں، بہت کچھ کرنے پر اُکساتی ہیں اور ایسے لمحے انسان کی زندگی میں بہت کم آتے ہیں خاص طور سے گل محمد جیسے آدمیوں کی زندگی میں ......ایک ایک قدم پر ذہنی کشمکش کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ کردہ گناہوں کا احساس اور ناکردہ گناہوں کی پاداش۔گل محمد جیسے لوگ اپنی نیکیوں کو بہت جلد بھول جاتے ہیں لیکن اپنے چھوٹے چھوٹے گناہ اُنہیں بار بار یاد آتے ہیں۔ گناہ اور ثواب کے چکر میں پڑنے والے لوگ اکثر بزدل کہلاتے ہیں لیکن جب انسان جانور بن جاتا ہے تو اُس کے دل سے گناہ اور ثواب کا احساس چند لمحوں کے لئے مٹ جاتا ہے۔ان لمحوں میں وہی کیا جاتا ہے جو جائز سمجھا جاتا ہے اور جائز گناہ بھی ہوسکتا ہے اور ثواب کا کام بھی۔اسی لئے جب گل محمد نے گل محمد سے کہا ''اُٹھو، سوچ کیا رہے ہو'' تو گل محمد نے حیرت سے گل محمد کی طرف دیکھا۔

بے وقوف اس طرح سے بے وقوفوں کی طرح سوچتے رہے تو رات بیت جائیگی، تمہارا صاحب ہر بڑے آدمی کی طرح بدنیت ہے، موسم خراب ہونے سے پہلے اُس نے تمہیں شہر کیوں بھیج دیا۔وہ اپنی بیوی کو گذشتہ ہفتے اپنے ساتھ لاسکتا تھا لیکن وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ادھر اُس نے دیکھا کہ موسم خراب ہونے والا ہے اور اُدھر تمہیں شہر جانے کا حکم دیا۔اچھے موسم میں تمہیں

بال تل سے شہر تک پہونچنے میں چار گھنٹے لگتے ہیں۔اُس ذلیل آدمی کی نیت خراب نہ ہوتی تو وہ تمہیں صبح سویرے بھیج سکتا تھا شام تک لوٹ آتے لیکن اُس نے جیپ گاڑی کی چابی پورے گیارہ بجے دے دی۔وہ اچھی طرح جانتا تھا، موسم کی پہلی برف باری سے راستہ خود بخود بند ہو جاتا ہے۔کم از کم چند گھنٹوں کے لئے۔تمہاری شہناز پر اُس کی نظر اُس وقت سے تھی جب تم اُسے پہلی بار اُس کوارٹر میں لے آئے تھے، کن حریص نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کم بخت اور آج......۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا......''۔

''تم کر بھی کیا سکتے ہو۔اب اپنی محبت کا ماتم کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لو۔کل تمہیں شہناز کی لاش ملے گی۔تمہاری شہناز کوارٹر میں اکیلی ہوگی۔گاؤں والے اُس کی آواز تک نہ سُن سکیں گے''۔

''میں اُس کتے کے پلے کا گلا گھونٹ دونگا''۔

''تمہیں تمہاری شہناز واپس نہ ملے گی''۔

''میں اُس کا انتقام لے لونگا''۔

''تم ایسا نہ کرسکو گے۔تم اُس پر الزام بھی نہ لگا سکو گے کیونکہ اس طرح خود تمہاری بدنامی ہوگی اور کیا معلوم شہناز بھی خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھے''۔

''نہیں وہ میری محبت ہے۔وہ مجھ سے کچھ نہ چھپائے گی''۔

''عورت ذات کو سمجھنا مشکل کام ہے۔گُل محمد سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے

سے کچھ بھی نہ ہوگا۔تمہارا صاحب بڑا آدمی ہے۔اُسکے ماتحت سینکڑوں لوگ کام کرتے ہیں۔وہ تمہیں کسی حقیر کیڑے کی طرح پاؤں تلے مسل سکتا ہے۔ بے وقوف تم اپنا انتقام ابھی اوراسی وقت لے سکتے ہو۔تمہارے صاحب کی خوبصورت بیوی دوسرے کمرے میں اکیلی ہے۔دور دور تک کسی اور ذی روح کا نام ونشان تک نہیں۔''

''لیکن یہ گناہ ہے۔''

''بزدل آدمی ،گناہ اور ثواب کے چکر میں پڑ گئے تو ہمیشہ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے،اس وقت وہ کرو جو جائز ہے''۔

''لیکن دروازہ بند ہے''۔

''دروازہ توڑا بھی جا سکتا ہے۔ہر آواز دبائی جا سکتی ہے''۔

''لیکن کل''۔

''کل کچھ بھی نہ ہوگا۔یہ رات بانجھ ثابت ہوگی۔رات کی کہانیاں صبح کی پلکوں پر دم توڑ دیتی ہیں۔

گل محمد اپنے آپ سے شکست کھا گیا۔

گل محمد کے جسم میں جیسے آگ لگ گئی۔شیر کی طرح چوکنا، مضبوط ارادے ،لرزتے ہوئے قدم ۔اُس نے میم صاحب کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا اور اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا اور اندر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

صبح بہت خاموش تھی یا صرف گل محمد کو اتنی خاموش محسوس ہو رہی تھی۔

میم صاحب کے چہرے پر میم صاحب کا چہرہ تھا جو صرف حکم دینا جانتا تھا، گل محمد نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھتے ہوئے سوچا۔

''عورت ذات کو سمجھنا کتنا مشکل کام ہے۔ شاید اسی لئے کہ کچھ سمجھنا ہی نہیں ہوتا''۔

سونہ مرگ کے بازار سے گذرتے ہوئے اُسے بتایا گیا کہ راستے سے برف ہٹائی جا چکی ہے۔ جیپ برف کے میدان کا سینہ چیر کر گزرنے لگی۔ آٹھ کلومیٹر کا راستہ خاموشی میں گذرا۔ صاحب کے رہائشی کوارٹر کے سامنے سے بھی برف ہٹائی جا چکی تھی۔ جیپ کی آواز سن کر کوارٹر کی طرف دوڑ پڑی۔ دروازے پر وہ کسی سے ٹکرائی۔ گل محمد کی بھنوؤں کے نیچے سیاہ لکیریں اور بھی لمبی ہو گئیں۔ میم صاحب کے ساتھ ٹکرانے والی شہناز تھی۔ دونوں عورتیں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ کچھ عجیب سی نظروں سے۔ پھر اپنی اپنی سمت کی طرف بڑھنے لگیں۔

''شکریہ گل محمد۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے'' صاحب نے اونچی آواز میں کہا۔ گل محمد نے نفرت سے آنکھیں بند کر لیں۔''

''شہناز''۔ صاحب کی آواز دوبارہ سنائی دی ''بیٹی، گل محمد کو گرم گرم کافی کے دو جگ پلا دو۔ بہت سردی کھا کر آیا ہے۔''

گل محمد سکتے کے عالم میں کھڑکی پر کھڑے پدرانہ مسکراہٹ لئے صاحب کو دیکھتا رہ گیا۔



مختصر افسانے

۱) ڈال اور ڈالر

ڈل میں جتنا پیسہ آرہا ہے اسی قدر اس کا پانی خشک ہو رہا ہے۔ عنقریب جب ڈل پروجیکٹ کا آخری مرحلہ طے ہوگا تو ڈل ڈالروں سے لبریز ہو چکا ہوگا لیکن اب کے باسی پانی کے ایک ایک قطرے کے لئے ترس رہے ہوں گے۔۔

۲) یومِ شہداء

۱۳؍ جولائی کی شام کو جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تو مزار شہداء مکمل تاریکی میں ڈوب گیا تو مزار شہداء کی تمام قبریں وا ہوئیں۔ سب شہید اپنی اپنی قبروں سے باہر نکل آئے اور جھاڑو لے کر مزار شہداء میں پھیلی ہوئی گندگی کو صاف کرنے لگے۔

۳) قومی شاہراہ

قوم کی طرح بے بھروسہ قومی شاہراہ ایک بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح اس کے وجود کو بے رحمی سے ڈس رہی تھی۔ گذشتہ برس اس کے باپ کو اس ناگن نے ڈس لیا تھا۔ اور آج اپنے باپ کے خوابوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر وہ ایک کنڈیکٹر کی حیثیت سے اُسی بس میں بیٹھتا تھا جسے اس کا باپ چلایا کرتا تھا۔

۴) رفتار

وزیر صاحب اپنے نوکر پر بُری طرح برس رہے تھے۔

''نالائق'' کام چور، کاہل، ہم دونوں ایک ساتھ صورہ کے میڈیکل اِنسٹی چیوٹ سے نکلے تھے۔ میں صرف پانچ منٹ میں پہنچ گیا اور تم لال چوک پورے دو گھنٹے بعد پہنچے۔ نوکر اپنی تمام تر ہمّت یکجا کر کے بولا۔ ''حضور میں بس میں آیا ہوں۔''

۵) جُرمانہ

بند مُٹھی میں دس روپے کا ایک میلا کچیلا نوٹ دبائے وہ کسی دیوالیہ تاجر کی طرح بیچ بازار کھڑا سوچ رہا تھا کہ ان دس روپیوں میں وہ سبزی خریدے یا دودھ یا گوشت۔ اچانک سارے بازار میں کھلبلی سی پیدا ہوئی۔ جج صاحب اپنے پورے عملے کے ساتھ بازار پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جُرمانے، سزائیں، ناقص اشیائے خوردنی کو دریا بُرد کر دیا گیا۔ اور پھر جب بپھرا ہوا سمندر شانت پڑ گیا تو وہ خالی ہاتھ گھر لوٹا۔ کیوں کہ سبزی کی قیمتوں میں مزید اِضافہ ہو گیا تھا اور گوشت غائب۔!

۶) سستی چیز

رات کے ٹھیک ساڑھے دس بجے جب کمرشل براڈ کاسٹنگ سے ''مردوں کے لئے آسان علاج'' والا اشتہار ختم ہوا تو آٹھ سالہ پپُو نے اپنے باپ سے پوچھا...... ''پاپا وہ کون سی ایسی چیز ہے جو صرف ۲۵ پیسے میں تین ملتی ہے......؟''

۷) راشننگ

از مقام عالم ارواح!

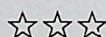
پیارے بیٹے۔

تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عالم ارواح میں بھی راشننگ ہو چکی ہے' اب ہر چیز راشن ٹکٹ پر ملتی ہے۔ قوانین وضوابطہ شدید ہیں۔ کسی بدروح نے میرے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے کہ زمین پر میرا بیٹا اب بھی میرے نام کی راشن کھا رہا ہے جبکہ مجھے عالم ارواح میں آئے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں...... مجھے راشن ملنا بند ہو گئی ہے۔ اس لئے اس خط کے ملتے ہی راشن کارڈ سے میرا نام کٹوا دو تا کہ مجھے یہاں راشن ملنا شروع ہو جائے۔

تمہاری بدنصیب ماں

۸) اونچی موت

سطح زمین سے پچاس فٹ اوپر بجلی کے کھمبے پر بیٹھا وہ تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔ کیوں کہ اسے اطمینان تھا کہ جب تک وہ اپنے کام سے فارغ نہیں ہوتا تب تک سب سٹیشن سے بجلی بحال نہیں ہوگی۔ سارے علاقے میں بجلی بند تھی۔ اسی اثناء میں وزیر صاحب تھکے ماندے گھر پہنچے۔ آج بھی بجلی کو غائب پا کر انہیں سخت غصّہ آیا اور ٹیلیفون کا ڈائل گھمانے لگے۔ انہوں نے ابھی چونگا واپس ریسیو پر رکھا ہی تھا کہ بجلی آ گئی۔ اور سطح زمین سے پچاس فٹ کی بلندی پر بجلی کھمبے پر بیٹھا ہوا وہ بجلی کے تاروں میں اُلجھ کر رہ گیا۔



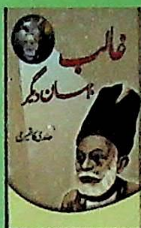


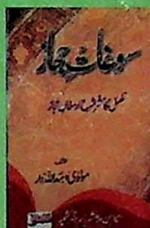
Umar Majeed Ke Behtareen Af...

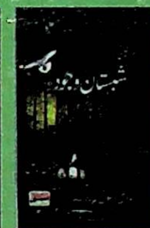




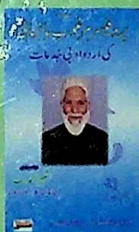


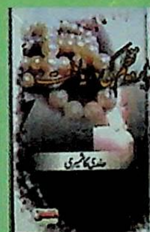
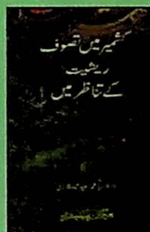



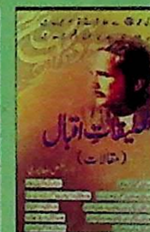



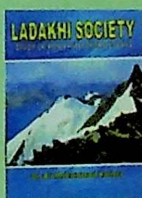


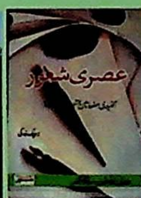


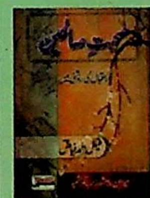
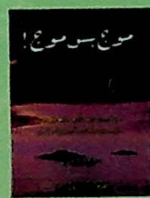
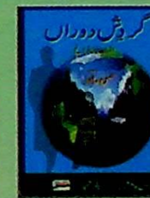


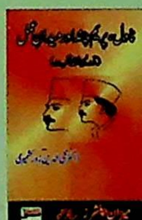



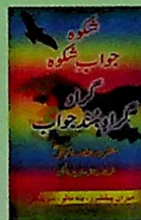




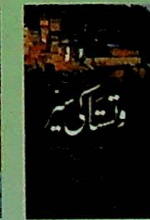









Meezan Publishers

Opp. Fire & Emergency Services H.Q., Batamaloo, Srinagar, Kashmir-190009

